اردو کی ترقی میں

مولانا آزاد کا حصہ

ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہاں پوری

انجمن ترقی اردو (ہند)۔ نئی دہلی

اُردو کی ترقّی میں مولانا آزادؔ کا حصّہ

اُردو کی ترقی میں مولانا آزاد کا حصّہ

اردو زبان کی ترقی میں مولانا ابوالکلام آزاد کی خدمات،
ان کے افکار اور علمی افادات کا تعارف

ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہاں پوری

انجمن ترقی اُردو (ہند) نئی دلّی

سلسلہ مطبوعاتِ انجمن ترقی اُردو ہند ۵۲۵

سنہ اشاعت: ۱۹۸۸ء
قیمت : ۲۲ روپے
طباعت : سمر آفسٹ پرنٹرز، نئی دہلی

—پتے—

انجمن ترقی اُردو (ہند)
اُردو گھر، راؤز ایونیو
نئی دِلّی۔ ۱۱۰۰۰۲

انجمن ترقی اُردو بک ڈپو
سلطان جہاں منزل
شمشاد مارکیٹ، علی گڑھ (یوپی)

فہرست

حرفِ آغاز

مولانا ابوالکلام آزادؔ بیسویں صدی کے برصغیر کی چند اہم ترین شخصیتوں میں سے ہیں۔ وہ جنگِ آزادی کے ہیرو ہیں، عظیم سیاسی رہنما ہیں، مذہبی عالم ہیں، مفسرِ قرآن ہیں، صفِ اوّل کے مکتوب نگار ہیں، صحافی ہیں اور شعلہ نوا مقرر ہیں۔

عربی اُن کی مادری زبان ہے۔ چار پانچ سال کی عمر سے اردو بولنی شروع کی اور اُردو زبان و ادب پر ایسی قدرت حاصل کی کہ صاحبِ طرز انشا پردازوں میں شمار ہوئے۔ انھوں نے فارسی اپنے شوق سے پڑھی، انگریزی اور فرانسیسی میں اتنی قدرت حاصل کرلی کہ ان زبانوں کی کتابوں سے استفادہ کرسکیں۔

اگرچہ اُردو میں بڑی تعداد میں مکاتیب کے مجموعے شائع ہوئے ہیں لیکن ادبی نقطۂ نظر سے مکتوب نگاری کی تاریخ میں غالبؔ کے بعد مولانا ابوالکلام آزادؔ کا نام آتا ہے۔ ان دونوں کے خطوط کی خصوصیات ایک دوسرے سے بہت مختلف ہیں، غالبؔ نے اُردو میں خطوط ضرورتاً لکھنا شروع کیے تھے جبکہ مولانا آزادؔ کے خطوط شوقیہ ہیں۔

میدانِ صحافت میں اُن کی حیثیت محض ایک صحافی ہی کی نہیں بلکہ ایک رہنما کی ہے۔ مولانا نے صحافت میں مواد اور طباعت کے جو معیار قائم کیے تھے آج ۸۵ سال گزرنے کے باوجود اُردو صحافت ان معیاروں سے آگے نہیں بڑھ سکی۔

آزادی سے قبل کے ہندوستان کے سیاسی حالات اور اس میں برطانوی سامراج کے گھناؤنے رول نے مولانا کو متنازعہ فیہ شخصیت بنا دیا تھا۔ اُن کی زندگی میں سیاسی مخالفین کی تعداد بہت زیادہ تھی لیکن اُن کے جو موافق تھے وہ اُن کے غیر معمولی مدّاح، معتقد بلکہ جاں نثار تھے۔ وہ وقت ضرور آئے گا، جب برصغیر کی سیاست میں مولانا کے رول اور ان کی

غیر معمولی خدمات کا دل سے اعتراف کیا جائے گا۔

مولانا مرحوم کی شخصیت کے دو پہلو ہمیشہ ہر متنازعہ سے بلند رہے ہیں ایک تو ان کی مذہبی شخصیت اور دوسرے اُردو زبان و ادب سے اُن کی محبت۔

مولانا کی ادبی زندگی کا آغاز دس، گیارہ برس کی عمر میں ہوا تھا۔ انھوں نے ۱۸۹۹ء میں شعر گوئی شروع کی۔ ان کی ابتدائی زمانے کی کہی ہوئی غزل کے تین شعر ہیں۔

نشتر بہ دل ہے آہ کسی سخت جان کی
نکلی صدا تو فصد کھلے گی زبان کی
گنبد ہے گردباد تو ہے شامیانہ گرد
شرمندہ میری قبر نہیں سائبان کی
آزاد بے خودی کے نشیب و فراز دیکھ
پوچھی زمین کی تو کہی آسمان کی

یہ غزل بمبئی سے شائع ہونے والے گلدستہ "ارمغانِ فرخ" کے ۱۸۹۹ء کے کسی شمارے میں شائع ہوئی تھی۔ اسی سال جون کے مہینے میں لکھنؤ کے ماہانہ "خدنگ نظر" میں مولانا کی جو غزل شائع ہوئی اس کا مطلع ہے ۔

کیوں اسیرِ گیسوئے خم دارِ قاتل ہو گیا
ہائے کیا بیٹھے بٹھائے تجھ کو اے دل ہو گیا

مولانا اُردو ادب میں باقاعدگی کے ساتھ ایک صحافی کی حیثیت سے داخل ہوئے۔ انھوں نے "نیرنگ عالم" کے نام سے ۱۸۹۹ء میں کلکتے سے ایک ماہانہ گلدستہ جاری کیا۔ اس وقت اُن کی عمر گیارہ سال تھی۔ یہ رسالہ سات آٹھ مہینے سے زیادہ جاری نہ رہ سکا۔ بارہ سال کی عمر تھی کہ مولانا نے مصر کے اخبار "مصباح الشرق" کے نام سے ایک ہفت روزہ جاری کیا۔ یہ رسالہ بھی تین چار مہینے ہی چل سکا۔

۱۹۰۱ء میں کلکتے سے "احسن الاخبار" جاری ہوا، اس کے مالک اور ایڈیٹر سید احمد حسن تھے۔ اس کی ادارت کا بیشتر کام مولانا کے ذمے تھا۔ اس اخبار نے مولانا کے کئی مضامین

شائع کیے۔ اس اخبار میں کام کرنے سے سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ مصر، قسطنطنیہ، طرابلس اور تیونس سے تبادلے میں جو اخبارات آتے تھے، اُن کے پڑھنے کا موقع ملتا۔ ۱۸۹۷ء میں "خدنگِ نظر" کے نام سے لکھنؤ سے ایک گلدستہ جاری ہوا تھا جس کا ذکر کیا جاچکا ہے بقول مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی ۱۹۰۰ء میں اس گلدستے میں مضامین بھی چھپنے لگے تھے اور اس کے نثری حصّے کی ترتیب مولانا کے ذمے تھی۔ اس وقت ان کی عمر ۱۲، ۱۳ سال تھی۔ ۱۹۰۳ء میں انھوں نے علامہ شبلی کے ماہانہ "الندوہ" کی ادارت کا کام بھی کیا۔ ۱۹۰۶ء اور ۱۹۰۸ء کے درمیان کافی عرصے تک امرتسر سے شائع ہونے والے "وکیل" میں کام کیا ۱۹۰۷ء کے اوائل میں مولانا نے "دارالسلطنت" میں مدیر کی حیثیت سے کام کیا اور بھی کئی رسالوں سے مولانا منسلک رہے۔ اِن کے علاوہ تین رسالے ایسے ہیں جو مولانا نے خود جاری کیے۔ ایک تو ماہانہ "لسان الصّدق" جو کلکتے سے ۱۹۰۳ء میں جاری ہوا دوسرا "الہلال" جو ۱۹۱۲ء میں جاری ہوا۔ اور تیسرا "البلاغ" جو ۱۹۱۵ء میں جاری ہوا۔ ان تینوں رسالوں اور خاص طور سے "الہلال" نے اُردو صحافت کے راستے پر جو مشعلیں روشن کیں، وہ آج بھی ہمارے لیے رہنمائی کا کام کرتی ہیں۔ آزاد ایسے ادیب یا صحافی نہیں تھے جن کا سارا وقت ادبی مشاغل میں صرف ہوتا ہو۔ ادب تو اُن کی زندگی کا بہت چھوٹا سا حصّہ تھا جس کی طرف وہ بہت کم توجہ دے پاتے تھے۔ اس کے باوجود اُردو ادب کی تاریخ میں وہ اپنے لیے ایک غیر معمولی مقام بنانے میں کامیاب ہو گئے۔

مولانا کا انجمن ترقیِ اُردو ہند سے گہرا تعلق تھا۔ جس دن انجمن وجود میں آئی تھی اُس دن سے لے کر وفات کے وقت تک مولانا کا انجمن سے ذہنی رشتہ قائم رہا۔ ۱۹۰۳ء میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ نے فیصلہ کیا کہ اُردو زبان کے نام سے ایک باقاعدہ شعبہ قائم کرے۔ اس شعبے کے صدر پروفیسر آرنلڈ اور سکریٹری علامہ شبلی منتخب ہوئے۔ یہ وہ وقت تھا جب مولانا اپنی ادبی و علمی صلاحیتوں سے علامہ شبلی جیسے زبردست عالم کو متاثر کر چکے تھے۔ علامہ نے مولانا کو پہلے تو انجمن کی مجلسِ انتظامیہ کا رکن منتخب کرایا اور پھر کچھ عرصے بعد انھیں جوائنٹ سکریٹری کے عہدے پر فائز کر دیا۔ مولانا نے انجمن کی خدمت

کا طریقہ یہ نکالا کہ "لسان الصدق" کے نام سے ایک ماہانہ رسالہ جاری کیا۔ اگرچہ اس رسالے کے مالک سو فیصدی مولانا تھے لیکن یہ انجمن ترقی اُردو کا سرکاری آرگن بن گیا۔ انجمن سے مولانا آزاد کی دلچسپی کے بارے میں، میں نے "مولانا ابوالکلام آزاد شخصیت اور کارنامے میں" جو کچھ لکھا تھا۔ اس میں میرے لیے کسی طرح کا اضافہ ممکن نہیں ہے اس لیے میں اسے ہی نقل کیے دیتا ہوں۔

انجمن ترقی اُردو

انجمن ترقیِ اُردو کے قیام سے لے کر مولانا کے آخری دنوں تک کسی نہ کسی حیثیت سے مولانا کا انجمن سے تعلق رہا ہے۔ "لسان الصدق" کے پہلے شمارے میں مولانا نے انجمن ترقیِ اُردو پر ایک نوٹ لکھا ہے اور نوٹ کے آخر میں مولانا کا نام اس طرح ہے۔ "مولانا ابوالکلام آزاد دہلوی اڈیٹر لسان الصدق و رکنِ انتظامی انجمن ترقی اُردو" اس نام سے اندازہ ہوتا ہے کہ جب ۱۹۰۳ء میں انجمن ترقیِ اُردو قائم ہوئی اور مولانا شبلی اس کے سکریٹری منتخب ہوئے تو مولانا ابوالکلام آزاد کو جن کی عمر اس وقت صرف پندرہ سال تھی، انجمن کی مجلسِ عام میں شامل کیا گیا۔ کچھ ہی عرصے بعد مولانا انجمن کے اسسٹنٹ سکریٹری بنا دیے گئے، یہ کہنا مشکل ہے کہ اس عہدے پر وہ کب تک فائز رہے۔ مولانا آزاد نے انجمن ترقی اُردو کے بارے میں لکھا ہے "انجمن ترقی اُردو نے اردو زبان کے علمی دائرے کو وسیع کرنے کی یہ صورت تجویز کی ہے کہ انگریزی، عربی، فارسی کی علمی اور فنّی کتابیں شگفتہ اُردو میں ترجمہ کر کے شائع کی جائیں، جن کی اشاعت سے قوم میں لغو اور بے نتیجہ ناولوں کے بجائے علمی کتابوں کے مطالعے کا شوق پیدا ہو۔ چناں چہ انگریزی، عربی، فارسی کی جو کتابیں انجمن نے انتخاب کی تھیں اُن کے ترجمے اور طبع کا انتظام، نہایت معقول طریقے سے ہو رہا ہے اور امیّد ہے کہ بہت جلد کتابیں طبع ہو کر ملک میں روشنی پھیلائیں گی۔ ان کتابوں کے فروخت کی نہایت آسان اور موزوں صورت یہ تجویز کی گئی ہے کہ جو شخص انجمن کی چھپی ہوئی کتابوں کو لینا چاہے وہ ایک سال میں پانچ روپے جیسی ایک قلیل رقم کی کتابوں کے لینے کا باضابطہ انجمن سے وعدہ کرے۔ ایسی حالت

یں مجبور نہیں کیا جائے گا کہ یکمشت پانچ روپے کی کتابیں خرید لے بلکہ چار مرتبہ یا تین مرتبہ متفرق کتابوں کو منگوانے کا وہ مجاز ہے۔ ہماری رائے میں اس سے بہتر اور آسان طریقہ کتابوں کے لینے کا جس میں لینے والے کو کسی قسم کے بار کا احساس نہیں ہوگا اور کوئی نہیں۔"

(لسان الصدق۔ نومبر ۱۹۰۳ء)

مولانا نے "لسان الصدق" کے نومبر ۱۹۰۳ء کے شمارے میں انجمن ترقی اُردو کے بارے میں لکھا: "محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے لٹریری سیکشن کا انجمن ترقی اُردو قائم کرنا واقعی ہمیں اُمید دِلا رہا ہے کہ اس انجمن کی بدولت یہ تمام ضرورتیں رفع ہو جائیں گی اور ہم ایک دن اپنی قومی زبان کو علمی زبانوں کی ہمسری کرتے ہوئے دیکھیں گے۔" "لسان الصدق" کا دوسرا مقصد (لسان الصدق کا یہ پہلا شمارہ ہے اور اس میں لسان الصدق جاری کرنے کے چار مقصد بیان کیے گئے ہیں) "ترقی اُردو" اسی انجمن کے متعلق ہے۔ یہ اُن تمام وسائل کو عمل میں لائے گا، جو ترقی اُردو کے لیے انجمن قرار دے گی۔ بالخصوص بنگالہ میں انجمن کے مقاصد کی اشاعت اور بنگالہ کی اہلِ قلم جماعت کو اس پر متوجہ کرنا" لسان الصدق" کا اہم فرض ہے۔"

"لسان الصدق" کے مقاصد میں ایک مقصد ترقیِ اُردو بھی تھا۔ اُردو کے مسائل سے متعلق "لسان الصدق" کے مضامین کے پیشِ نظر انجمن ترقیٔ اُردو نے اس اخبار کو اپنا آرگن قرار دیدیا۔ انجمن کے متعلق جس قدر مفید و دل چسپ باتیں ہوتی تھیں، مولانا شبلی انھیں سب سے پہلے اسی اخبار کو بھیجتے تھے۔ تمام ممبرانِ انجمن کو ہدایت دی گئی تھی کہ "لسان الصدق" ضرور منگوائیں اس لیے ایک بڑی تعداد متعلقینِ انجمن کی اس کی خریدار ہو گئی تھی۔ دو تین نمبروں کے بعد ہی اس کے چھے سات سو خریدار ہو گئے"۔ (ابوالکلام کی کہانی۔ ص ص ۲۸۸۔۲۹۰)

مولانا صرف انجمن ترقیٔ اُردو کے کاموں کی پبلسٹی ہی نہیں کرتے تھے بلکہ انجمن کو مفید مشورے بھی دیتے تھے۔ "لسان الصدق" کے ایک شمارے میں مولانا نے اعلیٰ ادبی کتابوں اور ۱۹۰۱ء میں شائع ہونے والی تصنیفات پر بھی تبصرہ کیا ہے، اس لیے یہ پورا نوٹ نقل کیا جاتا ہے۔ مولانا لکھتے ہیں:

ترقی اُردو نمبر ۲، انجمن ترقی اُردو

اُردو زبان میں آج تک جس قدر کتابیں شائع ہوئیں، چوں کہ وہ کسی خاص ترتیب اور انتظام سے تعلق نہیں رکھتی تھیں، اس لیے بجائے اس کے کہ اُردو لٹریچر میں کارآمد کتابوں کی افراط ہوتی، فضول اور بیہودہ کتابوں کی تعداد بڑھتی گئی۔ مصنّفین نے اپنا قلم پبلک کے مذاق کے تابع کردیا اور پبلک روز بروز اسی مذاق کی عادی ہوتی گئی۔ ایک جماعت نے تجارتی اصول پر قلم کو معاش کا ذریعہ بنانا چاہا، تو تجارت نے مصنّفین کی رہی سہی قابلیت بھی تباہ کردی۔

یورپ میں بے شک کتابیں تجارتی اغراض سے شائع کی جاتی ہیں اور تصنیفات نے درحقیقت تجارت کی صورت اختیار کرلی ہے لیکن یورپ اور ہندوستان کی حالتوں میں اس عظیم الشّان فرق ہے، ہمارے لیے اس کی تقلید نفع کی جگہ مضرّت کا باعث ہے، اوّل تو یورپ میں خود پبلک کا مذاق اعلیٰ درجہ کا شائستہ ہے اور جس قسم کی عمدہ تصنیف شائع کی جائے اس کے خیر مقدم کے لیے تیار رہے۔ ثانیاً ہر قسم اور ہر فن کے مذاق کے لوگ کثرت سے وہاں موجود ہیں۔ علوم و فنون کی کوئی شاخ بہ مشکل ایسی ملے گی، جس کا پبلک کی کسی خاص جماعت کو مذاق نہ ہو اور جو اس فن کی تصنیفات کی خواہش مند نہ ہو، اس لیے جس فن کی کتاب شائع کی جائے فوراً ملک میں کھپ جاتی ہے اور پبلیشر کو شائع کرتے ہوئے کسی کا خوف نہیں ہوتا بر خلاف ہندوستان کے، جہاں اس سرے سے اس سرے تک عام طور پر فضول قصّوں اور سطحی تصنیفات کا مذاق عالم گیر ہو رہا ہے اور ایسے لوگ بہت کم نظر آتے ہیں جو "فسانۂ آزاد" اور "جعفر عبّاسہ" کی جگہ "ہیروز اینڈ ہیرو ورشپ" اور "ایجوکیشن" کے خشک ترجموں کو خریدنا پسند کریں گے۔

باوجودیکہ یورپ میں علمی روشنی نے پبلک کو اچھے بُرے میں تمیز کرنے کا کافی موقعہ دے رکھا ہے لیکن پھر بھی بعض اوقات پبلک کے مذاق پر توجّہ نہ کرنے سے مصنّفین کو سخت دقّتیں پیش آئی ہیں، "اسمائل" جیسا مشہور مصنّف جس کی تصنیفات کو آج علمی دنیا اپنی آنکھوں میں جگہ دیتی ہے جب پہلے پہلے اُس کی ابتدائی تصنیف شائع ہوئی، وہ تصنیف جو آگے چل کر مقدّس بائبل کے ہم پہلو ہونے کا دعویٰ کرنے والی تھی، تو مدّت تک اس کے تمام نسخے الماریوں میں بند پڑے رہے اور ایک عرصہ میں وہ ایڈیشن ختم ہوا۔ "ہربرٹ اسپنسر" تمام عمر شاکی رہا کہ زمانے نے اس کی تصنیفات

کی قدر نہیں کی کیوں کہ اشاعت میں وہ ہمیشہ نقصان اٹھاتا رہا، جب یورپ کا یہ حال ہے تو ہندوستان میں کیوں کر توقع کی جاسکتی ہے کہ کتابیں اعلیٰ درجہ کی شائع کی جائیں اور پبلک اپنے مذاق کو چھوڑ کر یکایک اُن کو قبول کرلے؟

اگر کسی سال کی سرکاری رپورٹ دیکھی جائے تو اس امر کا اندازہ ہوسکتا ہے کہ ملک میں کس قسم کی کتابیں زیادہ چھپتی ہیں اور پسندیدگی کی وجہ سے کتنے ایڈیشنوں تک ان کی نوبت پہنچتی ہے؟ ۱۹۰۱ء میں ۷۵۴ کتابیں شائع ہوئیں جن میں ۲۳۱ کتابیں بیہودہ نظموں، ناولوں اور ادنیٰ درجہ کے مضامین کی تھیں اور تقریباً ۱۰۰ کتابیں معمولی درجہ کی، جن میں زیادہ تر درسی کتابیں یا اور کچھ چھوٹی چھوٹی سوانح عمریاں جو پنجاب کے مختلف پریسوں سے نکلا کرتی ہیں، ان کے مقابلے میں کل سولہ کتابیں تاریخ، ادب، سائنس اور صنعت و حرفت کو ملتی ہیں، جن میں درحقیقت سوا ایک کتاب کے جس نے گویا اس سال اُردو لٹریچر کی شرم رکھ لی اور کوئی کتاب قابلِ ذکر نہیں ہے۔!!

اس فہرست میں کوئی ناول اور نظم ایسی نہیں ہے جس کا اس سال دسواں یا بارھواں ایڈیشن نہ ہو اور ہر مرتبہ دو ہزار سے زائد نہ چھپی ہو، برخلاف اس کے "حیاتِ جاوید" کا پہلا ایڈیشن اب تک ختم نہیں ہوا باوجودیکہ وہ ایک ایسے شخص کی لائف ہے جس کو مخالف و موافق ایک عجیب وغریب وجود سمجھ کر دلچسپی کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔

جب ہمارے ملکی مذاق کا یہ حال ہے کہ سال بھر کی پانچسو کتابوں میں صرف ایک کتاب اعلیٰ درجہ کی نکلتی ہے اور اس کی طرف بھی پبلک خاطر خواہ توجہ نہیں کرتی تو پھر یہ کیوں کر توقع کی جاسکتی ہے کہ کتابیں تجارتی اغراض سے شائع کی جائیں اور قوم کا مذاق بھی درستی پر آجائے؟

مصر میں جب ابراہیم پاشا نے طریقِ تعلیم کی اصلاح کرنی چاہی اور عام طور پر علمی مذاق پیدا کرنا چاہا تو اُس نے اسی غرض سے ایک سرکاری انجمن قائم کی جس کا مقصد یہ تھا کہ یورپ کی مختلف زبانوں سے اور بالخصوص فرینچ سے اعلیٰ درجہ کی کتابیں مختلف علوم و فنون کے متعلق انتخاب کی جائیں اور ان کا ترجمہ عربی میں شائع کیا جائے۔ اسی صیغہ تراجم میں وہی اشخاص شریک کیے جاتے تھے، جو عربی لٹریچر میں کامل ہونے کے علاوہ یورپ کی مختلف زبانوں سے واقفیت رکھتے ہوں۔

اس انجمن نے علوم و فنون ہر شاخ میں متعدد کتابیں ترجمہ کر کے شائع کیں جس سے ملک میں عام مذاق پیدا ہو گیا۔ کتاب شائع کرتے ہوئے نہ انجمن کو اس کی فکر ہوئی تھی اور نہ مترجم کو کہ یہ کتاب پبلک کے مذاق کے موافق ہے یا نہیں اور کوئی اس کتاب کو خریدے گا یا نہیں؟ انجمن سرکاری تھی اور مصنّف و مترجم اُس کے ملازم' ان کا کام ہی یہی تھا کہ وہ پبلک میں عمدہ مذاق پیدا کریں۔ جب پبلک کا مذاق عمدہ حالت پر آگیا تو پھر عام طور پر اس قسم کی کتابیں شائع ہونی لگیں اور لوگ ذوق و شوق سے خریدنے لگے۔

"انجمن ترقی اُردو" کو پہلی مشکل جو پیش آئی وہ یہی ہے کہ اگر کتابیں اعلیٰ قسم کی شائع کی جائیں تو لامحالہ پبلک کے مذاق کی پیروی کرنی پڑے گی، تو اس کے لیے تو نول کشوری پریس اور کارخانہ پیسہ اخبار ہی کافی ہیں، پھر انجمن ترقی اُردو کی کون سی ضرورت ہے؟ انجمن سرِ دست اس قدر سرمایہ کہاں سے لائے؟ کہ بلا خیال عام مذاق کے عمدہ کتابیں شائع کرتی رہے اور پبلک کو ایک عرصہ میں اپنی طرف متوجہ ہونے پر مجبور کرے لیکن درحقیقت اس کا کوئی علاج نہیں ہے جب تک کہ ایک مستقل فنڈ انجمن کے پاس جمع نہ ہو جائے، کتابیں شائع کی جائیں اور اس کی بالکل پروانہ کی جائے کہ جلد نکلیں یا بدیر' ضرورت اور تعلیمی ذوق تھوڑے ہی عرصے میں ناول بین اور دیوان پرست جماعت کو مجبور کرے گا کہ وہ "ایجوکیشن" اور "فلسفۂ حسن" کو خریدیں اور ناولوں کے ساتھ اپنی الماریوں میں ان کے لیے بھی جگہ نکالیں۔

فنڈ کا جمع ہونا بے شک ایک دقّت طلب امر ہے لیکن جب یہ سوچا جائے کہ مسلمانوں کا کونسا مقصد ہے جو دِقّت طلب نہ ہو اور ساتھ ہی جس کا پورا ہونا اشد ضروری ہو، تو پھر ہمّت بڑھ جاتی ہے اور آمادگی پیدا ہو جاتی ہے کہ انجمن ترقی اُردو کے لیے قوم کو قطعی ایک کافی فنڈ مہیا کرنا چاہیے بشرطیکہ قوم ملکی زبان کو ایک ضروری بات تسلیم کرتی ہو' ورنہ یوں تو علی گڑھ کالج، ندوۃ العلما، حمایت اسلام سبھی قوم کا منھ تک رہے ہیں اور منتظر ہیں کہ ہماری ضرورتیں تسلیم کی جائیں لیکن ضرورت اس قدر معرضِ بحث میں ہے کہ یہ مسئلہ طے نہیں ہوتا؟

انجمن ترقی اُردو نے جس قسم کی کتابوں کا ترجمہ کیا ہے اور جن کے ترجمے ہو رہے ہیں، ان کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انجمن نے کسی خاص صیغۂ علمی کی اشد ضرورت تسلیم کر کے اُس پر توجہ

کرنے کی جگہ مختلف سلسلے جاری کردیے ہیں جن سے کام نہایت پریشان ہوگیا ہے۔ ایجوکیشن ہے کارلائل' رہنمائے ہند' نامۂ دانشوران' سولر سسٹم' فلسفۂ حسن' ان چھ کتابوں میں ایک کتاب فنِ تعلیم سے تعلق رکھتی ہے۔ ایک کتاب تاریخ کے ساتھ اخلاق پر مشتمل ہے' دو کتابیں مختلف لوگوں کے حالات' اور تاریخ کے متعلق ہیں' سولر سسٹم علمِ ہیئت کا ابتدائی رسالہ ہے' صرف آخری کتاب فلسفیانہ مضمون کی ہے۔ بے شک یہ کتابیں اعلیٰ درجہ کی ہیں اور ان کا ترجمہ اُردو میں کبھی غیر مفید نہیں ہوسکتا لیکن اُردو کی کم مائیگی اور قوم کی حالت کو دیکھتے ہوئے ہر صاحب الرّائے شخص یہی کہے گا کہ ابھی صرف سائینٹفک' اور فلسفیانہ کتابوں کی اشد ضرورت ہے۔

ان تمام کتابوں میں صرف تین کتابیں" ایجوکیشن' سولر سسٹم' فلسفۂ حسن" اس قابل ہیں کہ ان کا ترجمہ اُردو میں نہایت ضروری سمجھا جائے۔ باقی کتابوں کی ترقی اُردو کے لیے ابھی ایسی ضرورت نہ تھی کہ ان کو اور فلسفیانہ تصنیفات پر ترجیح دی جاتی' ابھی ہم کو یہ سمجھنا چاہیے کہ علم کس چیز کو کہتے ہیں؟ سائنس کیا چیز ہے؟ کس قدر وسیع ہے اور اس کی کتنی شاخیں ہیں؟ دنیا نے اس سے کیا فائدے حاصل کیے ہیں؟ اور ہم کیا حاصل کر سکتے ہیں انھی کتابوں کی ہم کو ضرورت ہے' جو ہم کو ان امور کے سمجھنے میں مدد دیں۔ اگر ہم راہ نمایانِ ہند کے حالات سے واقف ہو گئے یا ایک بہت بڑی جماعتِ علما و شعرا کے حالات معلوم ہو گئے' تو گو وہ ہمارے لیے مفید ہوں لیکن ابھی وہ ہم کو اس قدر فائدہ نہیں پہنچا سکتے' جس قدر کے سائنس اور فلسفہ سے ہم کو توقع ہے۔ پس انجمن ترقی اُردو کا کتابوں کو انتخاب کرتے ہوئے اس نکتے کو بُھلا دینا ہمارے لیے نہایت مضر ہوگا۔ اگر ایسی فاضل جماعت نے اِس نکتے پر توجّہ نہیں کی تو پھر کس سے اُمّید کی جاسکتی ہے؟"

مولانا کو انجمن ترقی اُردو سے ہمیشہ غیر معمولی دل چسپی تھی ۱۹۴۷ء کے فسادات میں دریا گنج دہلی میں واقع انجمن کے دفتر کو آگ لگادی گئی تھی۔ انجمن کی لائبریری اور بک ڈپو کی بیشتر کتابیں جل گئیں اور عمارت کو (جو ڈاکٹر مختار انصاری کی ملکیت تھی) سخت نقصان پہنچا۔ لائبریری کی جو کتابیں جلنے سے بچ گئی تھیں انھیں ڈاکٹر عبدالحق پاکستان لے جانا چاہتے تھے۔ مولانا آزاد نے اس کی مخالفت کی اور ڈاکٹر عبدالحق سے کہا کہ وہ اپنی ذاتی مطبوعہ کتابیں لے جاسکتے ہیں، باقی

مخطوطات اور مطبوعہ کتابوں پر اُن کا کوئی حق نہیں ہے۔ زبردست نگرانی کے باوجود ڈاکٹر عبدالحق کافی تعداد میں مخطوطات اپنے ساتھ لے جانے میں کامیاب ہو گئے۔ کچھ عرصے بعد مولانا آزاد نے انجمن کو علی گڑھ منتقل کر دیا۔ قاضی عبدالغفار کو اس کا جنرل سکریٹری منتقل کر دیا اور حکومت سے اڑتالیس ہزار روپے سال کی گرانٹ منظور کرادی۔

انجمن ترقی اُردو (دہلی) نے ۱۵ فروری ۱۹۵۸ء کو دہلی میں اُردو کانفرنس منعقد کی۔ اس کانفرنس کا افتتاح پنڈت جواہرلال نہرو نے کیا تھا۔ اس کانفرنس میں زندگی کی آخری عوامی تقریر کرتے ہوئے مولانا نے کہا: "آپ اُردو کے حامی ہیں لیکن کسی زبان کے مخالف نہیں ہیں جیسا کہ ابھی میرے دوست پنڈت جی (پنڈت سندرلال) نے کہا۔ یہاں ایک شخص بھی ایسا نہیں جو ہندی کا مخالف ہو۔۔ یہی صحیح اسپرٹ ہے اور اس اسپرٹ سے مل کر راستہ صاف ہوتا ہے۔ ملک آزاد ہوا، وقت آیا، دستور بنا، اسمبلی میں کافی بحث ہوئی اور اکثریت کے ساتھ ہندی کو ملک کی زبان تسلیم کر لیا گیا۔ جس کے نتیجے میں اُردو کی حیثیت میں ایک بنیادی انقلاب آگیا اور اُردو کی بات ایک رقیب کی حیثیت سے کم ہو گئی۔ اب ہر ہندوستانی کا، جو آئین کا وفادار ہے، فرض ہے کہ اُسے مانے۔ وہ اس کے خلاف نہیں جا سکتا۔۔۔ ہندی کو جو جگہ ملنی تھی وہ اُسے مل گئی۔ اب ہر ہندوستانی کا خاص فرض ہے کہ اس کے آگے سر جھکائے، لیکن اس کے ساتھ ہی اُردو کی جو جگہ ہے، وہ اُسے ملنی چاہیے ۔۔۔ مجھے یقین ہے کہ کانفرنس جس کے مقصد کے لیے بلائی گئی ہے، اُس میں اسے کامیابی ہو گی اور جب کہ وزیراعظم (پنڈت نہرو) نے اس کانفرنس کا افتتاح کیا ہے تو یقیناً یہ اپنے مقصد میں ناکام نہیں رہے گی۔"

(آزاد کی تقریریں، مرتبہ انور عارف دہلی، ۱۹۶۱ء ص ۲۹۲)

مولانا ابوسلمان شاہ جہاں پوری خود عالم، ادیب اور نقاد ہیں۔ خدا نے انھیں ان تمام صلاحیتوں سے نوازا ہے جو مولانا ابوالکلام آزاد کی شخصیت اور کارناموں کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے۔ اگر میں، مولانا ابوالکلام آزاد کے مدّاح اور معتقد ادیبوں اور نقادوں کی فہرست مرتب کروں تو ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہاں پوری کا نام شروع کے دو تین ناموں میں ہوگا۔ زیرِ نظر کتاب میں ابوسلمان صاحب نے آزاد کی لسانی اور ادبی خدمات کا بھرپور جائزہ لیا ہے۔ انھوں

نے مولانا کے اسلوب کا تجزیہ کرتے ہوئے اسے چار حصّوں میں (۱) دعوتی (۲) علمی (۳) ادبی اور (۴) بنیادی اسلوب میں تقسیم کیا ہے۔ مولانا فارسی کی ایک لغت مرتب کرنا چاہتے تھے جس کا کچھ کام ہو بھی گیا تھا لیکن غیر معمولی مصروفیت کی وجہ سے وہ کام آگے نہیں بڑھ سکا۔ ڈاکٹر سلمان شاہ جہان پوری نے اس کام کی پوری تفصیل بیان کی ہے۔ "لسان الصدق" کے حوالے سے سلمان صاحب نے انجمن ترقی اُردو سے مولانا کے تعلق پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔

اگرچہ یہ کتاب مختصر ہے لیکن بہت جامع ہے اور مولانا آزادؔ کی ادبی اور لسانی خدمات کا بھرپور جائزہ لیتی ہے۔

خلیق انجم

پیش لفظ

مولانا ابوالکلام آزاد اردو کے صاحبِ طرز ادیب اور مایۂ ناز انشا پرداز تھے اور اُردو زبان کی ترقی کے مسائل سے بھی انھیں خاص دلچسپی تھی۔ ادبی زندگی کے آغاز سے یہ اُن کا خاص موضوع رہا تھا اور زندگی کے ہر دور میں اس مسئلے سے ان کی دلچسپی برقرار رہی۔ وہ اردو کی ترقی اور اس کے گیسو سنوارنے کی سعی میں ہمیشہ مصروف رہے۔

پیشِ نظر تالیف کا مقصد مولانا آزاد کی علمی وادبی زندگی کے انہی دو پہلوؤں کی وضاحت ہے۔ اس کا پہلا حصہ مولانا کے اسالیبِ بیان کے مختصر تعارف میں اور دوسرا حصہ اردو کی خدمت کے سلسلے میں مولانا کے افکار و مساعی کے تذکرے میں ہے اور درحقیقت یہی اس کتاب کا خاص موضوع ہے، جسے بحث و مباحثے کی ضرورت و سہولت کے پیشِ نظر مختلف ابواب میں تقسیم کردیا گیا ہے۔ لیکن اردو کی ترقی میں مولانا کی خدمات کی بحث کی جامعیت اور تکمیل کے لیے ضروری تھا کہ ان کے اسلوب کے اقسام وخصائص پر بھی ایک سرسری نظر ڈالی جائے۔

اس کتاب کے ترجمے "حظ و کرب" یا "لذت والم" کے سلسلے میں مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا عبدالماجد دریابادی کے افکار کا کوئی حوالہ نہیں دیا گیا ہے۔ اس سلسلے کے تمام افکار و مباحث کو "ابوالکلام و عبدالماجد (ادبی معرکہ)" میں مرتب کردیا گیا ہے اور چونکہ وہ کتاب بھی ادب، لغات، اصطلاحات وغیرہ کے بارے میں دونوں بزرگوں کے افکار و افادات کا مجموعہ ہے، اس لیے اس کتاب میں ان مطالب کا اعادہ و تکرار تحصیلِ حاصل سمجھی گئی۔

ابوسلمان شاہجہاں پوری

حصہ اوّل

باب اوّل

اسالیبِ بیان

مولانا ابوالکلام آزاد کے اسلوب کی خوبیاں تو لسان الصدق (۵۔۱۹۰۳ء) کے زمانے ہی سے نمایاں ہونا شروع ہوگئیں تھیں۔ "سرمد شہید" پر مضمون (۱۹۱۰ء) میں یہ رنگ خاصا چوکھا نظر آتا ہے۔ "الہلال" (۱۹۱۲ء) میں مولانا کا اسلوب ارتقا کے عمل سے گزر کر پختہ ہوگیا ہے۔ اور تمام تر حسن اور دل ربائیوں کے ساتھ جلوہ ساماں ہوا ہے۔ اس کے خصائص متعین ہو گئے ہیں جن کی نشان دہی کی جاسکتی ہے۔ اب یہ اسلوب جیسا بھی ہے مولانا کا اپنا اسلوب ہے اور اس پر اچھے یا بُرے اور خوب یا ناخوب کا حکم لگایا جاسکتا ہے۔

الہلال کے ذریعے مولانا آزاد نے مسلمانوں کو ایک ایسے اسلوب میں مخاطب کیا تھا جس کا خمیر عربی اور فارسی کے خاص ذوق سے اٹھایا گیا تھا اور بلاغتِ قرآنی کے درس و افادہ نے اس سونے پر سہاگے کا کام کیا تھا۔ مولانا کے نزدیک یہ قلمی پستی کی بات تھی کہ طرزِ تحریر کو مخاطبین کے ذوق کے مطابق حسین و رنگین بنا کر پیش نہ کیا جائے۔ کسی اسلوب کی اصل خوبی تو حسن و دل ربائی ہے۔ اس خوبی کو ہاتھ سے جانے دیے بغیر اگر مقصدِ تحریر میں کامیابی حاصل ہوسکے تو اسے ہرگز ہاتھ سے نہ چھوڑ دینا چاہیے۔ مولانا نے الہلال میں زبان کے حسن و دل ربائی پر ایک اعتراض کے جواب میں لکھا تھا:

> "یہ قلمی پست ہمتی کم از کم ان لوگوں کے لیے تو جائز نہیں رکھی جاسکتی جنھیں اللہ تعالیٰ نے اپنے ہر طرح کے افکار کے ساتھ بیان کی قدرت بھی دی ہے۔ ذَالِکَ فَضْلُ اللّٰہِ یُؤْتِیْہِ مَنْ یَّشَاءُ۔ ان پر بلاغتِ قرآنی کے درس و افادہ سے فیضانِ بیان کا ایسا دروازہ کھول دیا ہے کہ دقیق سے دقیق اور خشک مطالب کو وہ حسن و عشق کی دلچسپ داستان بنا دے سکتے ہیں۔" (الہلال)

لیکن اردو زبان کی ترقی، اس کی مقبولیت اور اسے عوامی زبان بنانے کے لیے سادہ وآسان زبان لکھنے کو وہ ضروری سمجھتے تھے۔ اس سادہ، عام فہم اور ملک کے ہر گوشے میں بولی اور سمجھی جانے والی زبان کو ''ہندستانی'' کا نام دیا گیا تھا۔ اسی کو آزاد ملک کی قومی زبان بننا تھا اور یہ بات طے پائی گئی تھی کہ اسے فارسی اور ناگری دونوں رسمِ خط میں لکھا جاسکے گا اور ملک کے سرکار دربار میں دونوں کا یکساں چلن ہوگا اور کسی ایک رسم خط کا استعمال کرنا ہر شخص کے ذوق وسہولت پر منحصر ہوگا۔

اس زبان کے جو نمونے گاندھی جی کے اخبار میں مولانا کے مضمون' جامعہ ملیہ (دہلی) کی ایک کتاب اور پارلیمنٹ میں مولانا کی تقریروں کی صورت میں نظر سے گزرے ہیں اُس سے اُن کے فکر اور ذوق کا پتا چلتا ہے۔

ایک ادیب اور انشا پرداز کی حیثیت سے اُن کی شہرت کی بنیاد واقعی اُن کا اسلوبِ نگارش تھا جو انھوں نے الہلال میں اختیار فرمایا تھا۔ پھر جو تذکرہ میں نمایاں ہوا اور جس کا آخری مظاہرہ غبارِ خاطر کے خطوط میں ہوا۔ لیکن اُن کا صرف یہی ایک اسلوب نہ تھا۔ ان کے ہاں کئی اسلوب ملتے ہیں۔ ہر طرح کے مضامین کے لیے کوئی ایک اسلوب مناسب بھی نہیں ہوتا۔ ہر مضمون ایک جدا اسلوب کا متقاضی ہوتا ہے۔ یہ ادیب اور انشا پرداز کا کمال ہوتا ہے کہ وہ بحث ونظر کے ہر دائرے میں اسلوب تحریر اور طرزِ نگارش کا حُسن اور اس کی دل ربائی کو برقرار رکھے۔

الہلال ایک دینی اور اسلامی دعوت کا ترجمان تھا۔ وہ مسلمانوں کے تمام افکار واعمال میں انقلاب کا خواہاں تھا۔ وہ ملک کی آزادی کے لیے ایک دعوتِ انقلاب تھا۔ وہ بین القومی اور بین الاسلامی اتحاد کی پکار تھا۔ وہ ایک ادبی، تنقیدی اور تحقیقی مجلہ بھی تھا۔ ضروری تھا کہ پیشِ نظر مقاصد کے لیے وہ کوئی ایک ہی اسلوب نہ رکھتا ہو۔ موضوع اور محل کی مناسبت سے اس کی لَواسنجی کے کئی اسلوب ہونا ناگزیر تھا اور بلاشبہ الہلال کے مختلف مضامین الگ الگ اسالیب میں ملتے ہیں۔

مولانا آزاد کے طرزِ نگارش کے نمونے الہلال سے لے کر اُن کی کتب ورسائل اور تقاریر کے حوالے سے اُن کی پوری زندگی کے آخری دور تک ملتے ہیں۔ ہمارے پیشِ نظر مولانا کا پورا دورِ حیات ہے اور اس پورے دور کے کاموں کے حوالے سے مولانا کی تحریر ونگارش کے بنیادی اسالیب یہ ہیں۔

۱۔ دعوتی اسلوب:

الہلال اور البلاغ مولانا کی دعوت کے ترجمان تھے۔ وہ دعوت جس کے مخاطب صرف مسلمان تھے اور ان میں بھی خاص طور پر علمائے دین اور جدید تعلیم یافتہ طبقہ اس لیے انھیں ان کے ذوق کے مطابق ایک خاص زبان میں مخاطب کیا گیا تھا اور اس تخاطب میں ایک ایسا اسلوب اختیار کیا گیا تھا جو اِن طبقات کے لیے خصوصاً اور تمام مسلمانوں کے لیے عموماً اپنے اندر دل کشی کا سروسامان رکھتا ہو اور جو مولانا آزاد کی دعوتِ عزیمت و استقلال کی دل نشینی کا ذریعہ بن سکے۔ تذکرہ' الہلال ہی کے سلسلے کی ایک کڑی تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ الہلال اپنے عہدِ اشاعت میں انقلاب و عزیمت کی جس دعوت کا مظہر تھا' تذکرہ اس دعوتِ عزیمت کی تاریخ اور اصحابِ دعوت کی عزیمتوں کی تاریخ ہے۔ تحریک خلافت کے زمانے کی بعض تقریریں بھی اُس اسلوب میں ہیں' جن میں عزیمت اور دار و رسن کی دعوت دی گئی ہے۔

۲۔ علمی اسلوب:

مولانا کے علمی اسلوب کے نمونے الہلال کے دور سے لے کر آخری دور تک ملتے ہیں۔ ان نمونوں میں رسالہ' جامع الشواہد فی دخول غیر المسلم فی المساجد'، "مسئلہ خلافت و جزیرۃ العرب" اور بہت سے مقالات ہیں۔ لیکن اُن کے اسلوب کا سب سے بڑا اظہار ترجمان القرآن میں ہوا ہے۔ یہ رسائل و تصانیف علمی اسلوب ہی کے نہیں تحقیق کے بھی شاہکار ہیں۔

اوّل الذکر دونوں کتابوں میں چونکہ علمی مسائل کی تحقیق ہی مقصود نہ تھی بلکہ تذکیر و تبلیغ بھی پیشِ نظر تھی اور یہی کچھ مقصود ترجمان القرآن میں سورۂ فاتحہ کی تفسیر اور بعض سورتوں کے اہم مقامات و مباحث کی توضیح میں پیشِ نظر تھا۔ اس لیے اُن میں تفصیل کا عنصر نمایاں ہے۔ لیکن یہ ایسی تفصیل ہے جو ذوق پر گراں نہیں گزرتی۔ مطالعے کے دوران میں اُس کے مباحث کی طوالت اور بیان کے اطناب کا گمان بھی نہیں ہوتا۔ بلکہ جب ہم کسی بحث کی آخری سطر کے آخری لفظ پر پہنچ کر سانس لیتے ہیں تو اپنی وارفتگی و خود رفتگی کا احساس ہوتا ہے اور اندازہ ہوتا ہے کہ ہم کتنی دیر تک ایک سحرِ حلال میں گرفتار رہے ہیں۔

ترجمان القرآن ہی کا ایک حصہ ایسا ہے جہاں مولانا کے اسلوبِ تحریر کے قطرات میں دریاؤں کی وسعتوں اور سمندر کی پہنائیوں کا گمان ہوتا ہے۔ یہ حصہ ترجمان القرآن کے وہ نوٹس ہیں جو ترجمۂ قرآن

کے ساتھ ساتھ مضامین کی جامعیت اور مطالب کی گہرائی و معنویت کی نشان دہی کے لیے سورت کے آغاز سے اختتام تک نمایاں ہوتے رہتے ہیں اور ہر سورت کے بنیادی فکر اور روحِ تعلیم کو جامعیت کے ساتھ پیش کر دیتے ہیں۔ مطالبِ قرآن کی تفہیم و دل نشینی میں ان نوٹس کا ایک خاص مقام ہے۔ یہ نوٹس اجمالِ تحریر اور اعجازِ بیان کا شاہکار ہیں اور جامعیتِ مطالب کی ایسی مثال ہیں کہ ان میں نہ کوئی لفظ کم کیا جا سکتا ہے اور نہ کوئی عبارت کا حسن کسی ایک لفظ کے اضافے کا متحمل ہو سکتا ہے۔ مولانا نے خود ان کے مطالب کی جامعیت اور اجمال کی خوبی کی طرف ترجمان القرآن کے قارئین کی توجہ مبذول کرائی ہے۔

اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ترجمان القرآن کا بنیادی اسلوب اگرچہ علمی ہے لیکن اُس کی خوبی میں تفصیل و اجمال کے دونوں رنگ پائے جاتے ہیں۔ تفصیل کی خوبی تذکیر و تبلیغ کی ضرورت سے ہے۔ اور اجمال کی خوبی فکر و تدبر کی غرض اور مطالب پر عبور اور ان کی دل نشینی کے لیے ہے۔ ان دونوں خوبیوں سے ترجمان القرآن کے خاص و عام دونوں طرح کے قاری اپنے اپنے ذوق کے مطابق لطف اندوز ہوتے ہیں۔

۳۔ ادبی اسلوب:

اگرچہ الہلال، البلاغ، تذکرہ اور ترجمان القرآن کے اسالیب میں ادبیت کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ مولانا کے ادبی اسلوب کا شاہکار غبارِ خاطر ہے۔ مولانا کے اسلوب کی تلاش میں اصحاب نقد و نظر نے الہلال اور تذکرہ کے بعد سب سے زیادہ غبارِ خاطر ہی کو موضوع بنایا ہے۔

غبارِ خاطر کا اسلوب ایک خاص ماحول کی پیداوار ہے۔ یہ ایک ایسا ماحول تھا جہاں چند ساتھیوں اور چند کتابوں کے سوا تفریحِ طبع اور تسکینِ ذوق کا کوئی سامان بہم نہ تھا۔ ساتھیوں میں کوئی شخص مولانا کے ذہن و فکر کی بلندیوں کا ساتھ نہ دے سکتا تھا۔ ان میں بیشتر مولانا کے ذوق ہی سے ناآشنا تھے۔ اُن کی صحبت مولانا کے لیے خوشگوار تو کیا، زیادہ دیر تک قابلِ برداشت بھی نہ ہو سکتی تھی۔ اور کتابیں! تو اُن کا کل ذخیرہ بھی مولانا کی چند صبح و شام کے لیے کافی نہ ہو سکتا تھا۔

مولانا آزادؒ احمد نگر کے قلعہ میں قید تھے اور اُس کی سنگی دیواروں نے انھیں صرف چند گز کی وسعت عطا کی تھی جو کسی طرح بھی ذوقِ صحرا نوردی و بادیہ پیمائی کا بدل نہیں ہو سکتی تھی۔ اس لیے مولانا کو لامحالہ اپنے ہی ذہن و فکر کے لالہ زار کو سجانا پڑا۔ اسی لالہ زار کے نظاروں کی معجز نمائیوں کا نام غبار خاطر ہے۔

مولانا آزادؒ کے اسلوب کی دل ربائیوں کے بارے میں مولانا عبدالماجد دریا بادی لکھتے ہیں:

> "تحریر و انشا میں اپنے اسلوب کے موجد بھی تھے اور خاتم بھی۔ شروع میں اسلوب بیان ذرا ثقیل تھا اور کتاب "تذکرہ" میں تو ثقیل سے گزر کر اثقل ہو گیا ہے۔ لیکن جاذبیت نے رفاقت اس حال میں بھی نہ چھوڑی۔ رفتہ رفتہ ثقل لطافت میں تبدیل ہو گیا۔ غبارِ خاطر و کاروانِ خیال شگفتہ بیانی کے ماڈل یا مجسم نمونے ہیں۔ ان کی ادبیت، ادبی شخصیت کی وسعت اور بلندی دونوں کا پوچھنا ہی کیا۔ ہزاروں صفحات پر چھاپ لگی ہوئی ہے، اُن کی انفرادیت کی، اُن کے قلم کے بانکپن کی، اُن کی خدمتِ تخلیق کی۔ زبان کے باب میں کیا ملکہ لے کر آئے تھے! لکھنو میں مستقل قیام کچھ زیادہ لمبا نہیں رہا تھا۔ چند مہینے ہی تو شاید رہے تھے، لیکن زبانِ لکھنو کی نزاکتوں پر وہ عبور حاصل کر لیا کہ جیسے سدا کے لکھنوی ہوں!"
>
> (اردو کا ادیبِ اعظم ص ۲۵)

۴۔ بنیادی اسلوب:

مولانا آزاد کا ایک اسلوب وہ ہے جو اردو کا عام اسلوب ہے اور یہی اردو کا حقیقی اور بنیادی اسلوب ہے۔ یہ اسلوب دعوت و تبلیغ اور علم و تحقیق کے اسلوب سے بالکل الگ اور ادبی اسلوب

سے جدا اور نمایاں ہے۔ اردو کی ترقی، اُس کی وسعت و مقبولیت اور رواجِ عام کا دارومدار اسی اسلوب پر ہے۔ اردو کا یہ وہ اسلوب ہے جس کی بنیاد میر امّن دہلوی نے ڈالی تھی اور جو غالب کے خطوط میں نُمایاں ہوا تھا۔ سرسیّد، حالؔی اور بابائے اردو مولوی عبدالحق اس سلسلۂ اصحابِ اسلوب کی نمایاں شخصیات ہیں۔

مولانا آزاد کے کئی مضامین اور ۱۹۴۷ء کے بعد کی پارلیمانی تقریریں اسی اسلوب میں ہیں۔ اِس اسلوب کو ہم اردو کے بجائے "ہندستانی" کا اسلوب بھی کہہ سکتے ہیں۔ "ہندستانی" اردو کا وہ عوامی روپ تھا جسے ہندستان کی قومی اور سرکاری زبان بننا تھا۔

بعض ضمنی اور ذیلی خصائص کی بنا پر مولانا کے اسالیبِ بیان کو اس سے زیادہ قسموں میں بیان کیا جاسکتا ہے، لیکن بنیادی طور پر یہی چار اسلوب ہیں جو مولانا کی تحریروں میں اور الہلال میں نمایاں ہوئے ہیں۔

زبان کی بنیادی خوبی بلاشبہ اُس کا سادہ و عام فہم ہونا ہے اور یہی خوبی کسی اسلوب کی ہے کہ وہ مشکل، پیچیدہ اور دیر فہم نہ ہو۔ لیکن بعض مضمون اور مطالب ایسے ہوتے ہیں کہ ان کے بیان کے لیے دقیق زبان اور علمی اصطلاحات کا استعمال ناگزیر ہوتا ہے۔ ایسے مضامین و مطالب کے لیے اسلوبِ بیان عام فہم اور سہل نہیں ہوسکتا۔ مولانا کی اس حقیقت پر نظر تھی۔ ۱۹۲۷ء میں الہلال کا اجرا دوبارہ عمل میں آیا تو اُس کے پہلے نمبر ہی میں مولانا لکھتے ہیں

"ایک اہم سوال آیندہ الہلال کے مضامین اور اُن کے طرزِ بیان کا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ الہلال کے فوائد عام نہیں ہوسکتے، جب تک کہ اس کا دائرہ بحث و نظر عام فہم نہ ہو۔ اور عام فہم جبھی ہوسکتا ہے جب مطالب کے سہل ہونے کے ساتھ اُن کا اسلوبِ بیان اور زبان بھی سہل ہو لیکن مشکل یہ ہے کہ ہر طرح کے مطالب کا عام فہم طریقے پر بیان کرنا آسان نہیں۔ بعض دقیق اور علمی مطالب ایسے ہوتے ہیں کہ انھیں کتنا ہی گھلا کر بیان کیا جائے، ایک

حد تک مشکل اور گراں ضرور ہوں گے۔ اس مشکل کا ہم نے
یہ حل سوچا ہے کہ آیندہ الہلال میں دونوں قسم کے مضامین
درج کیے جائیں بڑا حصہ تو سہل و عام فہم ہو، لیکن کچھ حصہ
بلند اور خاص قسم کا بھی ہو۔ اس طرح عوام و خواص
دونوں کے ذوق و نظر کا سامان مہیا ہو جائے گا۔ باقی رہا
زبان کا معاملہ تو وہ ہر حال میں حتی الوسع سہل اور صاف
اختیار کی جائے گی۔ کسی درجے کا موضوع ہو لیکن اسلوبِ
بیان مشکل اور دیر فہم نہ ہوگا۔"

(الہلال، ۱۰ جون ۱۹۲۷ء، ج ۱، ش ۱)

ایک ادیب اور صاحبِ قلم کے لیے یہ صورتِ حال ایک چیلنج کی حیثیت رکھتی ہے۔ مولانا نے اس چیلنج کو قبول کیا اور اپنی تحریروں میں اور الہلال میں اسالیبِ بیان کا ایک محل سجا دیا۔ اور جب بھی کسی موضوع پر قلم اٹھایا تو خواہ وہ موضوع فلسفے کے بے نمک اور غیر دلچسپ عام مباحث ہوں یا تاریخ کے خشک واقعات و مضامین ہوں، اپنے دل چسپ و دل نشیں اسلوب سے دنیا کا حسین اور دل آویز ترین موضوع اور اسلوب کے حسن و دل ربائی کا تاج محل بنا دیا۔

حصّہ دوم

باب اوّل

خدمتِ زبان

اسلوب کے حسن و دل ربائی کے لالہ زار سجانے کے علاوہ مولانا ابوالکلام آزاد نے زبان کی ترقی اور ادب و تنقید کے میدان میں بھی بے مثال خدمات انجام دی ہیں۔

مولانا ابوالکلام آزاد کا خاندان دہلی میں کئی پشتوں کے قیام و سکونت کی بنا پر دہلوی کہلانے کا حق رکھتا تھا۔ مولانا کو دہلی کی روایات سے، تہذیب سے، اُس کی شخصیات سے دلی تعلق تھا اگرچہ انھوں نے اپنی زندگی کا ابتدائی حصہ حجاز کی مقدس فضاؤں میں گزارا تھا۔ وہیں ان کی تعلیم کا آغاز ہوا تھا۔ تقریباً دس سال کی عمر میں جب وہ ہندستان آئے تو کلکتہ میں قیام کیا۔ ان کی اردو کی تعلیم نہ حجاز میں شروع ہوئی تھی نہ کلکتہ میں اس کا کوئی انتظام کیا گیا۔ بعض قصّے کی کتابوں سے اُن میں اردو کتابوں کے مطالعے کا شوق پیدا ہو گیا تھا۔ پھر عبدالواحد سہسرامی کی صحبت میں انھیں شاعری سے دلچسپی پیدا ہو گئی۔ شاعری سے دلچسپی کی بنا پر باہر کی دنیا سے واقفیت ہوئی تو زبان کے مسائل کا ذوق پیدا ہوا۔ اس سفر میں کوئی شخص ان کا رہنما نہ تھا۔ سارا انحصار ان کے اپنے ذوق و مطالعہ پر تھا۔ دہلی و لکھنو کے اساتذہ کے کلام اور علمی و فنی رسائل کے مطالعے سے زبان کے مسائل کو سمجھا تھا اور اُس کی باریکیوں سے آشنا ہوئے تھے۔ سر سیّد کے رسائل اور حالؔی کی تصانیف و تالیفات کے ذوق اور زبان کے مسائل میں جلال لکھنوی، امیر مینائی وغیرہ کے بعض علمی اور فنی رسائل و مباحث اور برہانِ قاطع کے سلسلے کے لغت و فن کے تمام مباحث سے دلچسپی اور مطالعے کا ذکر انھوں نے خود کیا ہے اور اسی ذاتی مطالعے کی بدولت وہ دہلی اور لکھنو دونوں ادبی و لسانی اسکولوں کے خصائص پر نہ صرف علمی طور پر حاوی ہو گئے تھے بلکہ اس دائرے میں ان کا ذوق پختہ اور قلم خوب منجھ گیا تھا۔

مولانا عبدالماجد دریا بادی نے لکھنو کی زبان اور اس کی باریکیوں پر ان کی نظر اور قلم کے خصائص کا ذکر کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

"۱۹۱۲ء میں الہلال افقِ کلکتہ سے طلوع ہوا... اس نے اردو

صحافت کی جیسے دنیا ہی بدل دی۔ صورت و سیرت، مغز و قالب سب میں اپنے پیش رو اور معاصر ہفتہ وار وں سے بالکل مختلف اور کہیں زیادہ شاندار اور جاندار چھپائی، کاغذ، تصویریں، سب کا معیار اعلیٰ۔ رنگین سرورق پر ایڈیٹر کا نام یوں درج ہوتا" احمد المکنیٰ بابی الکلام الدہلوی" یہ المکنیٰ کے صحیح تلفّظ اور معنی کے لیے صراح و قاموس کی ورق گردانی کرنی پڑی۔ اور "ایڈیٹر" کہاں! اس کی جگہ "مدیر مسئول" "تحریر خصوصی اور رئیس قلم تحریر" جریدہ کی جگہ "مجلّہ" "ولایتی ڈاک کی جگہ" "برید فرنگ" "حیرت انگیز" کی جگہ "محیر العقول" قسم کے خدا جانے کتنے نئے اور بھاری بھرکم لغات اور نئی ترکیبیں، نئی تشبیہیں، نئے استعارے اور نئے اسلوب بیان ہر ہفتے اس "ادبی علمی ٹکسال" سے ڈھل ڈھل کر باہر نکلنے لگے اور جاذبیت کا یہ عالم تھا کہ نکلتے ہی سکہ "رائج الوقت بن گئے"۔

(اردو کا ادیب اعظم، ص ۱۵)

مولانا ابوالکلام آزادؔ نے صرف اردو زبان کی تحصیل ہی میں کمال حاصل نہیں کیا تھا بلکہ اس کی باریکیوں پر بھی گہری نظر رکھتے تھے۔ مولانا دریابادی نے ان کے اس کمال پر ان الفاظ میں روشنی ڈالی ہے:

" لکھنو کی زبان میں ایک نازک اور باریک سی چیز "پہلوئے ذم" ہے باہر والے تو اسے کیا سمجھیں گے، خود لکھنو ہی کے اچھے اچھے استاد یہاں آکر غچّا کھا گئے ہیں حسرت موہانی سے بڑھ کر زبان کے نکتوں پر نظر کس کی ہوگی لیکن اس میدان میں آکر لغزش کچھ نہ کچھ ان کے قدم کو بھی ہوگئی

جلالؔ لکھنوی استاد کیا معنی استادوں کے استاد ہوئے ہیں۔ یار لوگوں نے اس کوچے میں آکر ان کی بھی زبان کو پکڑا ہے۔

مولانا کا قیام لکھنؤ میں کچھ زیادہ طویل نہیں رہا... اور اس درمیان میں راہ و رسم لکھنؤ کے اہلِ زبان طبقے میں سے، بجز ایک مرزا محمد ہادی (ناول میں رسواؔ اور شعر میں مرزاؔ) کے شاید ہی کسی سے رہی ہو، اس کے باوجود پہلوے ذم کی باریکیوں میں نظر بال کی کھال پر رکھنے لگے تھے۔ اور لکھنویوں سے بڑھ کر لکھنوی ہو گئے تھے۔"

(اُردو کا ادیبِ اعظم، ص ۱۹)

یہ لکھنوی زبان اور اس کی باریکیوں پر اُن کے نظر و عبور کی کیفیت تھی، لیکن وہ بنیادی طور پر دہلی اسکول سے تعلق رکھتے تھے۔ دہلی اسکول کی چھاپ اُن کی زبان اور قلم پر بہت گہری تھی۔ اگر انھیں کسی اسکول سے وابستہ کیا جانا ہی ضروری ہو تو انھیں دہلی اسکول سے وابستہ کیا جائے گا۔

لیکن زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ وہ زبان اور ادب، دونوں میں اپنے ذاتی خصائص کے مالک تھے۔ ان کی پہچان لکھنؤ یا دہلی کا اسکول اور اس کے خصائص نہ تھے بلکہ ان کی زبان اور اسلوب اپنی پہچان آپ تھے۔ مولانا دریابادی مرحوم نے شاید اس خصوصیت کی بنا پر انھیں "ادبی علمی ٹکسال" قرار دیا ہے۔ لیکن یہ علمی ٹکسال دہلی یا لکھنؤ کی ٹکسال نہ تھی۔ اس سے بہت بلند اردو زبان کی ٹکسال تھی وہ ٹکسال جس پر دہلی اور لکھنؤ دونوں فخر کرسکتے ہیں۔

ماہرؔ القادری مرحوم زبان و ادب کا خاص ذوق رکھتے تھے۔ اگرچہ دورِ آخر میں مولانا ابوالکلام آزاد کے متعلق بعض مسائل میں ان کا ذہن گرد و پیش سے متاثر ہو گیا تھا۔ لیکن مولانا کے اسلوبِ بیان کے وہ شیدا اور زبان پر اُن کے عبور اور لسانی خدمات کے وہ معترف تھے۔ مولانا کے اسلوب اور زبان کے خصائص و خدمات کو انھوں نے دہلی یا لکھنؤ کے کسی اسکول سے وابستہ نہیں کیا۔ زبان کی خدمات کے سلسلے میں ماہرؔ القادری مرحوم لکھتے ہیں:

"وہ الفاظ کا کبھی غلط استعمال نہیں کرتے۔ مولانا عبدالماجد دریابادی مصنّف "فلسفۂ جذبات" نے اور PLEASURE کا ترجمہ "حظ و کرب" کیا تھا۔ مولانا ابوالکلام نے "حظ و کرب" کی جگہ "لذّت والم" الفاظ پیش کیے۔ مولانا عبدالماجد صاحب نے اپنے الفاظ پر اصرار کیا۔ اس پر علامہ ابوالکلام نے الہلال میں جو مضامین ارقام فرمائے، ان میں آپ کی معلومات اور عمیق نظری کا اندازہ ہوسکتا ہے کہ ابوالکلام کے وجدان کی انگلیاں الفاظ کی نبض پر ہمیشہ رہی ہیں۔"

(ابوالکلام و عبدالماجد (ادبی معرکہ) ص ۱۰۹)

مولانا ابوالکلام آزادؔ نے زندگی بھر اُردو کی خدمت کی۔ اُن کی خدمت کا کوئی ایک انداز اور ایک ہی دائرہ نہ تھا۔ اردو کی ترقی کے تمام مسائل اور وقت کی تمام ضرورتیں ان کے سامنے تھیں۔ انھوں نے حالات اور وقت کے مطابق اردو کی ترقی کے تمام پہلوؤں پر توجہ فرمائی اور ضروریاتِ وقت کے مختلف میدانوں میں انھوں نے اصحابِ ذوق کی رہنمائی کی۔

آیندہ صفحات میں اردو کی ترقی کے سلسلے میں مولانا آزاد کی خدمات و افکار کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی جائے گی۔

بابِ دوم

لُغات

زبان کے علمی و فنّی مباحث پر ایک نظر

زبان اور لُغات کے مسائل سے انھیں اپنی ادبی زندگی کے آغاز ہی میں دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ ان کی یہ دلچسپی زندگی بھر برقرار رہی۔ انھوں نے شروع ہی سے فارسی اردو کی ایک جامع لغت کی ضرورت کو محسوس کر لیا تھا اور فارسی لغت کی تحقیق میں ایک معقول ذخیرہ الفاظ و محاورات جمع بھی کر لیا تھا۔ کتاب کی وجہِ تصنیف کے بارے میں مولانا فرماتے ہیں:

"ہندستان میں فارسی لغت نویسی کی کچھ عجیب حالت رہی ہے۔ ادبیات کے کسی حصّے میں اس قدر تمسخر انگیز اغلاط اور گمراہیاں نظر نہیں آئیں گی، جس قدر ہندستان کی فارسی لغتوں میں، مثلاً محاورات میں مرزا غالب کی قاطعِ برہان اور ہدایت قلی کی فرہنگِ ناصری، اس کا اچھا سا نمونہ ہیں۔ چونکہ ان چیزوں سے اس وقت شوق پیدا ہو گیا تھا، خیال ہوا کہ ایسے تمام لغات اور محاورات اور اصطلاحات کو ایک فرہنگ میں جمع کیا جائے چنانچہ ایک معقول حصّہ ایسے الفاظ و محاورات کا جمع کر لیا"

(آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی۔ دہلی ایڈیشن، ص ۴۰۴)

اگرچہ یہ لغت مکمل نہیں ہو سکی اور مولانا کسی اور کام کی طرف متوجہ ہو گئے لیکن اس سے یہ اندازہ ضرور کیا جا سکتا ہے کہ فارسی لغات کی تمسخر انگیزیوں اور گمراہیوں پر شروع ہی سے مولانا کی نظر تھی اور وہ چاہتے تھے کہ اُن کی اصلاح ہو۔ فارسی اور اردو کا رشتہ جتنا قریبی ہے اور کسی زبان کی صحت مندانہ تشکیل اور ترقی میں لغت کی جو اہمیت ہے، وہ ظاہر ہے اور مولانا اس سے اس وقت آشنا

تھے جب اُن کی عمر سولہ برس سے زیادہ نہ تھی۔

اردو، فارسی اور انگریزی کے چند خاص لغتوں، مثلاً بہارِ عجم فرہنگ آصفیہ، غیاث اللغات، برہانِ قاطع کے سلسلے کے مباحث، پروفیسر ہامر کی کنائز پرشین انگلش ڈکشنری، ویلکس پرشین عربک اینڈ انگلش ووکیبلری، اسٹین گاس کی پرشین انگلش ڈکشنری وغیرہ کے بارے میں مولانا کی کیا رائے تھی اور مولانا کے نزدیک ان کا درجۂ استناد کیا تھا؟ مولانا نے اپنے مقالۂ الفتنۃ اللغویہ: "حظ وکرب یا لذّت والم" (الہلال۔ ۱۷ ستمبر و یکم اکتوبر ۱۹۱۳ء) کی دو قسطوں میں، اس پر اظہارِ خیال کیا ہے۔ یہاں صرف چند لغات کے بارے میں مولانا کی اجمالی رائے نقل کی جاتی ہے۔ مولانا فرماتے ہیں:

"۱۔ غیاث اللغات کوئی مستند لغت نہیں۔ اس کا حوالہ فارسی لغات کے مباحث میں بے کار ہے۔

۲۔ اتنا ہی نہیں بلکہ بہارِ عجم وغیرہ لغات جو آج کل چھپ کر شائع ہو گئی ہیں، قطعاً غیر معتبر، تمسخر انگیز، اغلاط سے مملو اور ناقابلِ استناد ہیں۔ جن حضرات کی ان کتابوں پر نظر ہے اور جنھوں نے وہ مباحث دیکھے ہیں جو برہانِ قاطع کی اشاعت کے بعد تحریر میں آئے، نیز ان رسائل پر بھی نظر ڈالی ہے جو ان لغات کی حمایت میں مثل مؤید البرہان ساطعِ برہان، تیغِ تیز تر، قاطعِ القاطع وغیرہ وغیرہ لکھے گئے اور پھر قاطعِ برہان کے اس دوسرے ایڈیشن کو بھی دیکھا ہے جو دانش کادیانی کے نام سے شائع ہوا تھا، ان سے یہ امر پوشیدہ نہیں۔

۳۔ یورپ کے بعض مستشرقین نے جو لغات لکھے ہیں، ان کا حوالہ بہ حیثیتِ سند لغت کے بالکل غیر معتبر ہے عام طور پر مستشرقینِ فرہنگ کا یہ حال ہے کہ وہ مشرقی علوم والسنہ کے متعلق بعض اپنے مخصوص مباحثِ علمیہ میں

نہایت مفید و نادر مطالب پیدا کر لیتے ہیں، جس پر
خود اس زبان کے بولنے والوں کو دسترس نہیں۔ لیکن
اس کے یہ معنی نہیں ہو سکتے کہ لغات و ادب کی بحث
میں ان کی سند معتبر ہو۔"

(الہلال، یکم اکتوبر ۱۹۱۳ء، ص ۲۰/۱۹)

مولانا ابوالکلام آزاد زندگی کے وسطی اور آخری دور میں بھی جب کہ سیاسی زندگی کے ہنگاموں نے ان کی علمی و تصنیفی زندگی کے شیرازے کو ورق ورق کر دیا تھا، زبان کے مسائل پر سوچتے رہے تھے اور زندگی کے اس مصروف ترین دور میں بھی اپنے بعض نیاز مندوں کو بہ سبیلِ مراسلت ہدایات فرماتے رہتے تھے۔

مولانا غلام رسول مہر کی مشہور تالیف "غالب" (۱۹۴۶ء) شائع ہوئی اور حضرت مولانا کی نظر سے گزری تو انھیں لکھا:

"مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ آپ ایک مکمل سوانح عمری لکھنی
چاہتے ہیں، اگر یہ خیال ہوا ہوتا تو بہت سی باتیں آپ
کو لکھ کر بھیج دیتا۔ کتاب پڑھتے ہوئے ہر تیسرے چوتھے
ورق کے بعد ایسے مقامات آئے۔ میرے لیے اس طرح
کی معلومات کا زبانی کہہ دینا آسان ہے، لکھنا مشکل ہے
تاہم کوشش کروں گا کہ پہلی فرصت میں بعض ضروری
باتیں لکھ کر بھیج دوں تاکہ دوسرے ایڈیشن میں کام آئیں۔"

مہر صاحب نے مولانا کے خیالات اور معلومات سے استفادے کی یہ صورت نکالی کہ "غالب" کے ایک نسخے میں بیچ بیچ میں سادہ ورق لگوا کر مولانا کی خدمت میں بھیج دیا۔ یہ نسخہ کئی سال تک مولانا کے پاس رہا۔ ان اوراق میں مولانا نے غالب اور اس عہد سے متعلق بہت سی یادداشتیں اپنی معلومات اور اپنے والد کی روایات سے تحریر فرما دیں۔ اور بعض مقامات پر مولانا مہر مرحوم کی تحریر میں اصلاح بھی فرما دی۔ ان یادداشتوں اور اصلاحوں میں بہت سے نکتے زبان و بیان اور لغات و لسانیات سے

متعلق ہیں۔ مولانا مہر مرحوم نے "غالب" کے دوسرے ایڈیشن میں ان معلومات کو متن میں شامل کر لیا تھا۔ اور مولانا آزاد کے انتقال کے بعد جب انھوں نے مولانا کے خطوط "نقشِ آزاد" کے نام سے مرتب فرمائے تو مجموعے کے آخر میں مولانا کے قلم میں تمام یادداشتیں بھی مرتب فرما دیں۔ مولانا کے افکار و افادات کے اس ذخیرے میں سے زبان و بیان اور لغات و لسانیات سے متعلق افادات کو اس تالیف کے قارئین کے لیے یہاں مرتب کر دیا جاتا ہے۔

مولانا آزاد نے زبان و قواعد کے بارے میں اپنی ان یادداشتوں میں جو کچھ تحریر فرمایا ہے، اسے دو حصوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے)

اولاً—— وہ مباحث جو غالب کی زبان دانی اور فارسی میں ان کے نظر و عبور سے متعلق ہیں۔ اس سلسلے میں غالب کے استاد عبدالصمد (ان کی شخصیت کے وجود یا عدمِ وجود کی بحث سے قطع نظر) اور برہانِ قاطع کے سلسلے میں لکھتے ہیں:

"عبدالصمد غیر معمولی قابلیت و استعداد کا آدمی تھا۔ مرزا غالب نے "دانش کادیانی" کے آخر میں جو فوائد لکھے ہیں اور انھیں عبدالصمد کی طرف نسبت دی ہے ان سے اس حقیقت پر روشنی پڑتی ہے۔ فارسی زبان کے اصول و قواعد اور قدیم فارسی کے رموز و دقائق کا اگر وہ ماہر تھا تو یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے، لیکن عجیب بات یہ ہے کہ سنسکرت اور قدیم فارسی کے باہمی رشتے کا راز بھی اس پر کھل چکا تھا اور دونوں زبانوں کے مرادفات کی صحیح مثالیں بڑی حد تک اس پر نمایاں ہو چکی تھیں۔"

مرزا غالب "دانش کادیانی" کے فواید میں لکھتے ہیں:

"در زبانِ دری و زبانِ سنسکرت توافق بیش ازاں ست کہ شمردہ آید"

پھر مثالیں دی ہیں جو صحیح ہیں اور سر ولیم جونس وغیرہ کے ابتدائی مباحث میں بھی ان ہی سے کام لیا گیا ہے۔ مہ اور مہا، سوم بہ معنی ہ، سگم بہ معنی رفیق، پاتی بہ معنی مکتوب و پتیا بہ معنی

پیام، دُشٹ سنسکرت بہ معنی نگاہ وشست فارسی، پرتاب در ہر دو زبان بہ معنی بزرگی وکرامت، پرشاد و فرشاد بہ معنی تبرک، باس ہندی و باش فارسی، ہر دو بہ معنی سکونت، مہمان بہ معنی ضیف وضیافت، کان وکھان بہ معنی معدن، چگل وچھاگل بہ معنی ظرفے کہ برائے نگاہ داشتنِ آب از چرم سازند، دشت در ہر دو زبان بہ معنی مکروہ، جال در ہر دو زبان بہ معنی دام، تال در ہر دو زبان بہ معنی آب گیر، تِگل بہ کسرِ اوّل مرادف پنبہ و در سنسکرت تھگلی، بوم فارسی بہ معنی زمین، بھوم وبھومی در سنسکرت بہ ہمیں معنی، تپاسں فارسی وتپسیا سنسکرت بہ معنی ریاضت، جنگل بہ معنی بیابان در ہر دو زبان مشترک، سریر در فارسی جسم وشریر در سنسکرت، کام فارسی بہ معنی مقصد و سنسکرت بہ معنی شہوت وجماع، کامنا بہ معنی خواہش، مَن بہ میم مفتوح در ہر دو زبان بہ معنی قلب، بانو وبنو بہ معنی خاتون، سنان واستھان بہ معنی محل، ساسان در فارسی ہماں معنی دارد کہ در سنسکرت سنیاسی دارد۔۔۔ یعنی درویشِ مرتاض۔"

سلاطین سامانیہ کے تلقب کی وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ ان کا مورثِ اعلیٰ قلندرانہ زندگی بسر کرتا تھا۔

' الف' فارسی کے ابتدا کلمہ میں افادۂ نفی کرتا ہے۔ مثلاً اخواستی واجنبان۔ سنسکرت میں بھی یہی اثر رکھتا ہے۔ مثلاً امر واچل۔

مرزا غالب نے اس مشابہت کی طرف بھی اشارہ کیا ہے اور 'دال' اور 'ہے'، 'سین' اور شین وغیرہ کے استبدال کی بھی مثالیں دی ہیں، جو بالکل صحیح ہیں۔

پارسیوں کا دینی لٹریچر:

پارسیوں کا جو دینی لٹریچر اٹھارھویں اور انیسویں صدی میں مستشرقینِ یورپ اور بمبئی کے پارسیوں کی کوششوں سے نمایاں ہو کر شائع ہوا، اس میں بعض چیزیں ایسی ہیں جو صریح اسلامی عقائد اور اسلامی روایات کا عکس معلوم ہوتی ہیں۔ مثلاً زردشت کی معراج، جنت ودوزخ کے مشاہدات۔ پُل صراط وغیرہ۔

اسپیگل وغیرہ محققین ان تحریرات کی زبان واسلوب کے مطالعے کے بعد اس نتیجے تک پہنچے کہ بعد از عہدِ اسلام کے مجوسی اختراعات ہیں اور ان کی قدامت زیادہ سے زیادہ دسویں صدی عیسوی تک لے جائی جا سکتی ہے اور وہ بھی ہر تحریر کے لیے نہیں۔

معلوم ہوتا ہے کہ عبد الصمد پر یہ حقیقت اچھی طرح منکشف ہو چکی تھی۔ چنانچہ "دانش کادیانی" کے خاتمے میں، سب سے پہلا فائدہ اسی مضمون کا ہے۔ میمناد اور چنبود وغیرہ مصطلحات کو بعد کی اختراعات قرار دیتے ہیں اور لکھتے ہیں

" مولانا ہرمزد ثم عبد الصمد ایں راز با من می گفت و بر
فریب و نیرنگِ پارسیان می خندید و نگارندۂ دبستانِ
مذاہب را یکے از اینان می دانست۔"

البتہ معلوم ہوتا ہے کہ دستاویز کے بارے میں جو دھوکا سر ولیم جونس وغیرہ کو ابتدا میں ہوا تھا، اس کی حقیقت عبد الصمد پر نہیں کھلی تھی۔ وہ دساتیر کو ساسانِ پنجم کی واقعی تصنیف تصوّر کرتا تھا اور مرزا غالب بھی عمر بھر اسی دھوکے میں رہے۔ حالانکہ دساتیر بھی سرتاسر جعلی و اختراع ہے اور قطعاً ظہورِ اسلام کے بہت بعد لکھی گئی ہے۔ ملا فیروز نے گورنر بمبئی کی فرمائش سے اس کا ترجمہ کر کے مع اصل کے شائع کیا تھا، لیکن بہت جلد اہلِ علم کا فیصلہ اس کے خلاف صادر ہو گیا۔

لطف کی بات یہ ہے کہ اس میں ساسانی حکومت کے خاتمے اور نازیوں کے استیلا کی خبر بھی صاف صاف لفظوں میں دے دی گئی ہے، نیز ظہورِ اسلام کی، گویا ساسان پنجم اردشیر بابکان کو اہورامزد کی وحی سے یہ امور معلوم ہو گئے تھے۔

محققین کا فیصلہ ہے کہ اس کی زبان 'اوستا' یا اس کی شرح 'پاژند' کی زبان نہیں ہے بلکہ محض ایک بناوٹی اسلوب ہے، جس میں پرانے الفاظ جمع کر دیے گئے ہیں۔

بہر حال عبد الصمد ایک غیر معمولی علم و استعداد کا آدمی تھا۔ بلاشبہ مرزا غالب کی غیر معمولی فارسی نسبت و رسوخ میں اس کی تعلیم کو بہت بڑا دخل ہوگا اور اس بارے میں جو جو کچھ لکھتے ہیں، حرف بہ حرف صحیح ہے۔

دبستانِ مذاہب کے مصنف کی نسبت بھی ان کا خیال صحیح معلوم ہوتا ہے۔ آذر کیوان کا ایک شاگرد اس کا مصنف تھا۔ محسن فانی وغیرہ کی نسبتیں غیر معتمد ہیں۔ سر ولیم جونس نے پہلے اس کتاب کو تاریخ ایران کی مشکلات کا حل سمجھ لیا تھا اور بڑی ٹھوکر کھائی تھی۔ ان ہی کے

ایما و معارف سے محمد حسین نے اسے کلکتہ سے چھاپا تھا۔

برہانِ قاطع والی مصیبت:

رام پور کے مجموعے سے معلوم ہوتا ہے کہ کلبِ علی خاں ابتدا میں مرزا غالب سے ادبی علائق رکھنا چاہتے تھے اور ایک نثر معاینے کے لیے بھیجی تھی۔ بہ ظاہر شاگردانہ درخواستِ اصلاح تھی۔ مگر دراصل ان سے مداحی کرانا چاہتے تھے۔ انھوں نے بڑی تعریف کی۔ طاہر وحید اور طباطبائی سے بڑھا دیا۔ لیکن چونکہ اصلاح کے معاملے میں دانستہ تسامح ممکن نہ تھا، اس لیے بعض الفاظ کی تصحیح کر دی۔ کلبِ علی خاں پر یہ بات گراں گزری۔ ان کے اساتذہ نے ہندستانی لغت نویسوں کی عبارتیں نکال کر پیش کر دیں اور وہ انھوں نے مرزا کو بھیج دیں۔ مرزا بے چارے اب رام پور کے وظیفے پر جی رہے تھے۔ یہ معاملہ دیکھ کر بہت پریشان ہوئے۔ برہانِ قاطع والی مصیبت یہاں بھی پیش آگئی۔ پہلے ہندستانی لغت نویسوں کے باب میں اپنا عقیدہ لکھا۔ پھر جب اس پر کلبِ علی خاں بگڑ گئے، تو زارنالی کر کے معافیاں مانگیں۔

ارتنگ اور ارژنگ کو برہانِ قاطع وغیرہ نے مرادف لکھا ہے، لیکن قطعاً غلط ہے۔ ارتنگ مطلق مرقع کے معنی میں بولا گیا ہے۔ جیسے ارتنگ مانی۔ اور ارژنگ ایک مصوّر کا نام تھا۔ نظامی نے "شیریں خسرو" میں کہا ہے:

بقصرِ دو لتم مانی و ارژنگ
طرازِ سحری بستند بر سنگ

نواب کلبِ علی خاں نے اپنی نثر میں انھیں مرادف سمجھ کر جمع کر دیا تھا۔ غالب نے اس سے اختلاف کیا۔ اسی طرح "آشیاں چیدن" کو عرفی کے مکتبی شارحوں نے "آشیاں بستن" کے معنوں میں لیا ہے، مگر غلط ہے۔ کلبِ علی خاں اس پر مصر ہوئے اور ثبوت میں عرفی کی شرح پیش کی۔

زمانے کی ستم ظریفی:

زمانے کی ستم ظریفی دیکھیے۔ چاہیے کہ غالب جیسے مغرورِ فن و کمال کو ایک خام کار مسند نشین کے آگے کس کس طرح جھکا کر چھوڑا! اور کس لیے؟ صرف اس لیے کہ جانتا تھا کہ اگر سو روپے ماہوار بخشش بند ہو گئی، تو جینے کا کوئی سہارا باقی نہ رہے گا۔ جب کلبِ علی خاں نے تواضعاً لکھا

کہ نسبت تلمذ رکھتا ہوں، تو لکھتے ہیں:

"یہ دوکانِ بے رونق کی خریداری ہے۔ میں تو حضور کو اپنا استاد، اپنا مرشد، اپنا آقا جانتا ہوں۔ اب پیر و مرشد نے لکھا ہے کہ ارتنگ وارژنگ متحد المعانی ہیں، تو میں نے بے تکلف مان لیا۔ نہ لغت نویسوں کے بموجب بلکہ اپنے خداوند کے حکم کے مطابق۔"

پھر جب اس پر بھی اظہارِ ناراضگی ہوا، تو لکھتے ہیں:

"خط پڑھتے ہی کانپ اٹھا۔ عالم نظروں میں تیرہ و تار ہو گیا۔ گناہ معاف کیجیے نویدِ عفو سے تقویت پہنچائیے۔"

پھر جس شخص کی رگِ گردن اس قدر سخت ہو کہ ہندستان کے تمام فارسی ادیبوں میں سے خسرو کے سوا اور کسی کے آگے نہ جھکتی ہو، فیضی اور ابوالفضل جیسے باکمالوں کو بھی خاطر میں نہیں لاتا ہو۔[1] وہ کلبِ علی خاں کے آگے ہاتھ جوڑ کر سر جھکا رہا ہے کہ "میں نے خداوندِ نعمت کا حکم مان لیا اور اپنی تحقیق سے باز آیا۔"[2]

اخبار "دوربین" اور کلکتے کے ادبی ہنگامے:[3]

"کلکتے میں انگریزی حکومت کے استقرار کی وجہ سے نئی چیزوں سے لوگ آشنا ہو چکے تھے۔ فارسی میں کئی اخبار نکلے۔ من جملہ ان کے 'دوربین' بھی تھا جس کے کئی ایڈیٹر ہوئے آخری

---

[1] ایک خط میں صاحب عالم مارہروی کو مخاطب کر کے میرزا غالب لکھتے ہیں:

"ہندستان کے سخن وروں میں حضرت امیر خسرو دہلوی کے سوا کوئی استاد مسلم الثبوت نہیں ہوا۔ خسرو کیخسروِ قلمروِ سخن طرازی ہے، یا ہم چشم نظامی گنجوی و ہم طراح سعدی شیرازی ہے۔ خیر فیضی بھی نغز گوئی میں مشہور ہے۔ کلام اس کا پسندیدہ جمہور ہے۔" (عودِ ہندی، ص ۶۱)

[2] ایک دوسری جگہ فیضی کے بارے میں لکھتے ہیں:

"میاں فیضی کی بھی کہیں کہیں ٹھیک نکل جاتی ہے۔"

[3] یہاں سے اس مبحث کے آخر تک کی عبارت "ابوالکلام کی کہانی خود ان کی زبانی" مرتبہ مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی سے ماخوذ ہے۔

ایڈیٹر نواب شمس الہدیٰ مرحوم کے والد [نواب عبداللطیف] تھے۔

میں نے ان کے وہ پرچے دیکھے ہیں، جن میں میرزا غالب مرحوم کے ہنگام ورود و قیامِ کلکتہ، یہاں کے مشاعرے اور صحبتیں، شعرائے کلکتہ کی مخالفت اور مثنوی بادِ مخالف وغیرہ حالات چھپے تھے۔ اور پھر ایک پرچے میں میرزا غالب مرحوم کی بالالزام قمار بازی، دلی میں گرفتاری اور سزایابی کی خبر بڑے طعن و تشنیع و استہزا کے ساتھ چھپی تھی۔ اس وقت کلکتے کے شعرا و ادبا ان اخبارات میں فارسی نظم و نثر لکھا کرتے تھے۔ غدر کے بعد جب میرزا غالب مرحوم نے قاطعِ برہان، شائع کی جس میں 'برہانِ قاطع' پر اعتراضات کیے گئے تھے، اور ان کے ایرادات مقلدینِ لغتِ ہند پر نہایت شاق گزرے اور ایک عام ایجی ٹیشن ان کے خلاف پھیل گیا تو اس میں بڑا حصہ کلکتہ کے ان فارسی اخبارات ہی نے لیا تھا، اور بہ کثرت مضامین اس موضوع پر شائع ہوتے رہتے تھے۔ میں نے وہ تمام پرچے دیکھے ہیں۔"

برہانِ قاطع:

"میری تیرہ برس[13] کی عمر تھی کہ مدراس کے ایک اخبار "جریدۂ روزگار" میں "یادگارِ غالب" کا اشتہار دیکھا۔ یہ اخبار ہر ہفتے سرورق پر ایک مخمس قدسی[رح] کی مشہور نعتیہ غزل "مرحبا سید مکی مدنی العربی" چھاپا کرتا تھا۔ اس لیے حافظ ولی اللہ، والد مرحوم کے خادمِ خاص اور میرے الف بے تے کے استاد، اسے بڑی دلچسپی سے پڑھا کرتے تھے۔ والد مرحوم کے ایک مرید حاجی مصلح الدین سوداگر، انھیں ہر ہفتے لاکر دیا کرتے تھے۔ بہ ہر حال میں نے بڑے شوق سے کتاب منگائی۔ یہ میرے اردو مطالعے کا بالکل آغاز تھا۔ کتاب میں برہانِ قاطع، کے معرکے کا جب حال پڑھا تو شوق ہوا کہ یہ تمام کتابیں دیکھنی چاہییں۔ چنانچہ 'قاطعِ برہان' اس کا دوسرا ایڈیشن 'درفشِ کاویانی'، 'قاطع القاطع'، ساطعِ برہان محرقِ قاطع، مؤیدِ برہان، تیغِ تیز، شمشیرِ تیز وغیرہ تمام رسائل بہ سعی و جستجو جمع کیے۔ چونکہ اس زمانے میں فارسی ادب اور فارسی لغات کے مطالعہ و تحقیق کا بھی شوق تھا اور تصحیحِ الفاظ کی بڑی کاوش رہتی تھی، اس لیے پوری دلچسپی کے ساتھ مطالعے کا موقع ملا۔ واقعہ یہ ہے کہ میرزا غالب نے یہ چند اجزا لکھ کر علم و تحقیق کی بڑی خدمت انجام دی ہے۔ افسوس ہے کہ خواجہ حالی نے

[یادگارِ غالب میں] اس بحث کو زیادہ تفصیل کے ساتھ نہیں لکھا۔

قاطعِ برہان کے رد میں سب سے زیادہ بسوط کتاب، مولوی احمد علی کی موید البرہان ہے۔ یہ ڈھاکہ کے باشندے تھے۔ مگر ایرانیت کے تصنع میں اپنے نام کے ساتھ آغا لکھواتے تھے۔ کلکتہ کے فارسی دانوں میں اس تصنع کا مرض عام طور پر رہا ہے۔ اب بھی بنگال کے بہت سے خاندان اپنے کو غزنوی، غوری، شیروانی اور سہروردی ظاہر کرتے ہیں۔ یہ مدرسہ عالیہ میں مدرس تھے۔ ایشیاٹک سوسائٹی کی مطبوعات کی تصحیح بھی کرتے تھے۔ فارسی مثنویوں کے حال میں ایک رسالہ "ہفت آسمان" لکھا تھا: جو [ایشیاٹک] سوسائٹی نے چھاپ دیا ہے۔

میرزا کے حالات میں ضروری ہے کہ اس معاملے پر بہ تفصیل نظر ڈالی جائے۔ برہانِ قاطع کی جو خرافات انھوں نے نقل کی ہیں، انھیں پڑھ کر تعجب ہوتا ہے کہ کوئی صاحبِ بصیرت کیوں کر ان کی تائید کر سکتا ہے؟ مگر مصیبت یہ ہے کہ سارا معاملہ ایک طرح منطقی مصادرہ تھا۔ اعتراض ہندی لغت نویسوں پر تھا اور ہندی لغت نویسوں ہی کا کام بہ طور دلیل کے پیش کیا گیا تھا۔

رضا علی خاں ہدایت، صاحبِ "مجمع الفصحا" نے میرزا غالب کے چند سال بعد فرہنگ "انجمن آرائے ناصری" لکھی، جو تہران میں چھپ گئی ہے۔ اسے پیشِ نظر رکھنا چاہیے اور اس معاملے پر ابتدائے مباحث نقل کر کے بہ تفصیل بحث کرنی چاہیے۔ فارسی لغت کے لیے صرف یہی لغت مستند تصور کی جا سکتی ہے۔

کیا اچھا ہو اگر "دانش کاویانی" کو بعد کے مباحث کے اضافے کے ساتھ از سرِ نو شائع کر دیا جائے۔ یا تیغِ تیز اور لطائفِ غیبی بجنسہٖ آخر میں شائع کر دی جائیں۔ "دانش کاویانی" میں طباعت کی غلطیاں بہت ہیں۔ ان کی تصحیح ضروری ہے۔"

ثانیاً۔۔۔ زبان و قواعد کے وہ اصول جو مولانا آزاد نے غالبؔ (تالیفِ مہر) کی زبان کی اصلاح اور حسنِ انشا کے پیشِ نظر تحریر فرمائے ہیں، مثلاً کو کا محلِ استعمال، بعض الفاظ و تراکیب محاورات و مرادفات کا استعمال، ضمائر میں اعجاز کی رعایت، بیگم اور خانم، صاحب اور صاحبہ کا موقع و محل استعمال۔ اِن اصول کے بارے میں مولانا فرماتے ہیں:

"میں نے جا بجا عبارات و الفاظ کی نسبت بھی اشارات کیے ہیں۔ ان کی درستگی پر خصوصیت کے ساتھ زور دوں گا آپ کا اسلوب پختہ اور بے داغ ہو جائے گا، اگر ان امور پر نظر رکھی جائے۔"

(نقشِ آزاد، ص ۱۷۵)

اس سلسلے میں مولانا کے افادات یہ ہیں:

۱۔"کو" کا محلِ استعمال: مہر صاحب کے کسی جملے میں "کو" کے استعمال کے بارے میں ہدایت فرماتے ہیں:

"کو" کے محلِ استعمال کا معاملہ ذہن نشین کر لیجیے۔ یہ بہت نازک معاملہ ہے۔ "قاعدے کی رو سے" ہر طرح کے مطالب کو بے تکلفی کے ساتھ نظم کرتے ہیں"، صحیح ہے مگر محاورہ اور روزمرّہ یہاں علامتِ مفعول کو حشو قرار دے گا۔ میں اسے یوں کہوں گا "ہر طرح کے مطالب بے تکلّفی کے ساتھ نظم کرتے ہیں"۔ بغیر "کو" کے کہیے اور کان لگائے رکھیے۔ خود کان کہہ دے گا کہ "کو" زائد ہے۔"

ایک اور جملے میں "کو" کے استعمال کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں:

"اردو کی علامتِ مفعول کا یہ استعمال خلافِ محاورہ ہے اوائل میں مجھ سے خود یہ تسامح ہوا ہے۔ زمانے کی حالت

کو سامنے رکھ کر" نہیں کہنا چاہیے"۔ زمانے کی حالت سامنے رکھ کر" بغیر "کو" کے عبارت کی تقدیر معنوی علامتِ مفعول سے مستغنی ہے۔ اسی طرح یاد رکھنا چاہیے" مجھ کو کہا" یا" مجھ کو بھیجا" خلافِ محاورہ ہے"۔ مجھے کہا" اور مجھے بھیجا" لکھنا چاہیے۔ مزید مثالیں اس پر قیاس کر لیجیے۔

۲۔ الفاظ و تراکیب: مولانا غلام رسول مہر نے ایک مقام پر" تمتع اندوز" کی ترکیب استعمال کی تھی۔ اس کے بارے میں مولانا لکھتے ہیں:

" تمتّع اندوز" صحیح ترکیب نہیں بنی۔" تمتع" باب تفعّل سے خود" حاصل کردن" کا افادہ رکھتا ہے۔ اگر یہی صیغہ استعمال کرنا ہے تو صاف لفظ" متمتع" ہے۔ لکھیے،" دو برس سے زیادہ متمتع نہ ہو سکے"۔ تمتع اندوز کی دور دراز اور کج راہ کیوں اختیار کی جائے؟

یہ بھی یاد رکھیے کہ الفاظ و تراکیب میں بہ مقصد و تکلف موٹے لفظ نہیں لانے چاہییں۔ ان لفظوں کو معانی و مفاہیم کی نزاکتوں کے تقاضے سے خود بہ خود آنا چاہیے اور وہی بلاغت کی شان پیدا کرتے ہیں۔ یہاں ایک زبان دان دوسرے صاف و سہل لفظ بول جاتا۔ مثلاً۔ دو برس سے زیادہ فائدہ نہ اٹھا سکے"۔

۳۔ فارسی تراکیب کا معاملہ: بعض فارسی تراکیب جو مولانا مہر مرحوم نے" غالب" میں استعمال کی تھیں، ان کے بارے میں مولانا آزاد تحریر فرماتے ہیں:

" شادمانی افزا" رواں ترکیب نہیں ہے۔ سماعت پر گراں گزرتی ہے۔ اس کی جگہ" عشرت افزا"،" نشاط افزا" وغیرہ لکھنا چاہیے۔

دونوں ترکیبیں بول کر دیکھیے۔ پہلی گراں گزرتی ہے یا نہیں؟
دوسری رواں اور سبک ہے کہ نہیں؟ پہلی میں "شادمانی"
بہ اعتبار مقدار کے زیادہ وزنی لفظ آگیا ہے۔ اس لیے
"افزا" کے ساتھ میل کھاتا نہیں۔ دوسری میں "عشرت" اور
"نشاط رباعی" سے زیادہ نہیں ہیں۔ یعنی چار حرفوں سے
زیادہ نہیں۔ اس لیے "افزا" کے ساتھ ترازو میں رکھا تو
دونوں پلّے برابر ہوگئے۔
اس قسم کی فارسی ترکیبوں کے لیے یہ ایک نہایت
دقیق قاعدہ بن گیا۔ اسے ہر گوشے میں لے جائیے اور
ہر ترکیب کے لیے کام میں لائیے۔"

۴۔ بعض الفاظ و محاورات: چند الفاظ و محاورات مولانا مرحوم نے اپنی تحریر میں استعمال کیے تھے۔ ان کی اصل کے بارے میں مولانا نے ان خیالات کا اظہار فرمایا:

"یاد رکھیے "آمد"[1] بہ معنی "آمدنی زمینداره" بہ معنی "زمینداری"
"ٹھاٹھیں مارنا" بہ معنی "جوش و خروش" "مخول" بہ معنی "تضحیک"
اردو نہیں، پنجابی ہے۔ برائے خدا ان سے احتراز کیا جائے۔
کیا مصیبت ہے کہ اردو اخبارات کی سرخیوں تک میں
ٹھاٹھیں مارنا بلا تامل لکھا جارہا ہے! مولوی ظفر علی خاں
اسے غالباً قلعۂ معلّی کی زبان سمجھے ہوئے ہیں۔"

۵۔ مرادفات کا استعمال: مرادفات کے استعمال میں مولانا آزاد کا ایک خاص انداز رہا تھا، لیکن اردو میں وہ مرادفات کے استعمال کو اصولِ بلاغت کے خلاف اور حشو و زوائد میں شمار کرتے تھے۔ مولانا مہر کی تحریر میں ایک مقام پر کسی مرادف کا استعمال دیکھ کر انھیں یہ ہدایت فرمائی:

---

[1]۔ اس بارے میں مولانا مہر صاحب نے حاشیے میں لکھا ہے "جو نکتہ بیان فرمایا وہ خاص توجہ کا محتاج ہے۔

[2]۔ "آمد پر مولانا مہر مرحوم نے یہ حاشیہ لکھا ہے"، یہاں یہ عرض کر دینا چاہیے کہ میرزا غالب نے اپنے مکاتیب میں "آمد" بہ معنی آمدنی غالباً ایک سے زیادہ مقامات پر لکھا ہے اور میں نے مولانا کی خدمت میں عرض کر دیا تھا۔"

"ایک ہی مفہوم کو ادا کرنے کے لیے مرادف الفاظ کو جمع
کر دینا فارسی انشا پردازی کا ایک خاص اسلوب تھا۔
اردو میں بھی اس کا تتبع کیا جاتا ہے، مثلاً "یہ بات ظاہر
و روشن ہے"، "زید کی مالی و معیشتی حالت" لیکن بلاغت کا
مقتضی اس کے خلاف ہے۔ ہمیشہ کوشش کرنی چاہیے
کہ ہر مفہوم کے لیے ایک ہی لفظ استعمال کیا جائے، مگر ایسا
لفظ جو اپنے محل میں پوری طرح موزوں ہو۔ جب ایک لفظ
ایسا بول دیا گیا تو اب ہر دوسرا مرادف حشو ہوگا۔ اور حشو
بلاغت کے خلاف ہے۔"

۶۔ ضمائر میں ایجاز کی رعایت: ضمائر کے استعمال کے سلسلے میں مولانا آزاد تحریر فرماتے ہیں:

"ضمائر میں ایجاز کی جس قدر رعایت کی جائے گی عبارت
کا حسن نمایاں ہوگا۔ اس کا خیال رکھیے، مثلاً "یہاں مولانا
بھی باغیوں کی اعانت سے متہم ہوئے اور انھیں حبس
دوام کی سزا ملی"۔ "انھیں" بہ لحاظ محاورہ و روزمرّہ زائد ہے۔
بغیر "انھیں" کے پڑھیے روانی کتنی بڑھ جاتی ہے۔"

۷۔ صاحب اور صاحبہ کا استعمال: "صاحبہ" کا استعمال اب اردو میں عام ہوگیا ہے، لیکن اکثر موقعوں پر ثقاتِ زبان کے استعمال کے خلاف۔ اگرچہ غیر اہلِ زبان کے لیے رعایات کا دائرہ وسیع ہونا چاہیے، لیکن صحت کے لیے ہمیشہ ثقاتِ کی زبان ہی معیار قرار پائے گی۔ "صاحبہ" کے استعمال کے بارے میں مولانا آزاد تحریر فرماتے ہیں:

"بیگم صاحبہ" میں "صاحبہ" ثقات کے طرزِ تکلم کے خلاف
ہے۔ صرف بیگم ہونا چاہیے۔ علاوہ بریں یہ نکتہ بھی یاد
رکھنا چاہیے کہ دہلی کے ثقات کبھی "بیگم صاحبہ" نہیں
کہتے تھے۔ بیگم صاحب کہتے تھے۔ اور یہی کانوں کو ٹھیک

معلوم ہوتا ہے "صاحبہ" مولویوں نے اظہارِ عربیت کے لیے
لکھنا شروع کیا اور اب بہت سے لوگ جو اہلِ زبان کے
دقائق سے بے خبر ہیں، لکھنے لگے ہیں۔ آپ اس سے
احتراز کریں[1]۔"

"بیگم صاحبہ" پنجاب اور پورب کی بول چال ہے۔ ثقاتِ دہلی کی زبان "بیگم صاحب" ہے۔"

۸۔ بیوی اور بیگم کا فرق اور محلِ استعمال: بیوی اور بیگم میں ایک فرق ہے اور بلاغت کا تقاضا ہے کہ محلِ استعمال میں اس لطیف فرق کا خیال رکھا جائے۔ "غالب" ہی میں کسی جگہ "بیگم" کے استعمال کے بارے میں مولانا تحریر فرماتے ہیں:

"یہاں اوّل تو بیگم کی جگہ "بیوی" لکھنا تھا۔ کیوں کہ عنوان کا مقصد بہ حیثیتِ شوہر کے اپنی بیوی سے محبت رکھنا ہے۔ پس بیوی ہونا چاہیے، نہ کہ بیوی کا تعظیمی لقب۔ پھر بیگم لکھنا تھا تو اس کے ساتھ کچھ اور نہیں لکھنا تھا: "بیگم سے محبت" گویا "بیگم" کو آپ نے "بیوی" کے مجرد معنوں میں لے لیا۔"

۹۔ بیگم اور خانم کا فرق: اسی سلسلہ بحث میں بیگم اور خانم کا فرق بھی مولانا کے قلم سے ظاہر ہو گیا۔ مولانا فرماتے ہیں:

" مسز کی جگہ عام طور پر "بیگم" بولنا حال کا استعمال ہے پہلے بیگم صرف امرا کی بیویوں کے لیے مخصوص تھا۔ متوسط طبقے کے شرفا میں "بیگم" سے بیویوں کو مخاطب نہیں کرتے تھے۔ البتہ "خانم" کا استعمال عام تھا۔ نام کے جز کی حیثیت سے بھی، جیسے زہرا خانم، اور حرم کے معنوں میں بھی، جیسے

---

[1] مولانا مہر مرحوم نے "غالب" کے پہلے ایڈیشن میں "بیگم صاحبہ" استعمال کیا تھا۔ اس پر یہ ارشاد ہوا تھا۔ "غالب" کے دوسرے ایڈیشن میں مولانا کے مشورے کو قبول کر لیا گیا۔

"مرزا صاحب کے یہاں سے خانم کی سواری آئی ہے"۔

یاد رکھیے! یہ بھی خانم "صاحبہ" نہیں ہے "صاحب" ہے۔

گویا "بیگم" انگریزی کے "لیڈی" کی جگہ تھا "مسز" کی جگہ نہ تھا'

۱۰۔ مسز کا صحیح بدل: مولانا آزاد الفاظ کے معانی، ان کے فرق اور ان کے محلِ استعمال اور زبان کی باریکیوں ہی پر نظر نہ رکھتے وہ لفظوں کی نفسیات سے بھی واقف تھے مسز کے صحیح بدل اور لفظ "بیگم" کے بارے میں مولانا نے جو کچھ تحریر فرمایا، وہ بڑی توجہ کا طالب ہے۔ مولانا نے تحریر فرمایا ہے:

"آج کل جب لوگوں کو "مسز" کی جگہ کسی موزوں لفظ کی جستجو ہوئی تو "بیگم" کا لفظ سامنے آگیا اور عام طور پر بولا جانے لگا۔ اب چونکہ زبانوں نے قبول کر لیا ہے۔ تو ٹھیک ہے، چلنے دیا جائے، ورنہ "مسز" کے لئے "بیگم" سے زیادہ موزوں "خانم" تھا۔ "بیگم" کو "لیڈی" کی جگہ رہنے دیا جاتا آج کل اسس قدر کثرت سے استعمال کیا جا رہا ہے، پھر بھی امارت کی اسس قدر تیز بو اس میں بس گئی تھی کہ اب بھی سونگھی جا سکتی ہے!

دراصل "لیڈی" کی طرح "بیگم" بھی چنڈول عہد کے امتیازات کی یادگار ہے۔ جمہوریت و عمومیت کی روح کے ساتھ ایسے تلقب جمع نہیں ہو سکتے"۔

مولانا آزاد کے ان افادات کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ زبان کی باریکیوں پر ان کی نظر و عبور کے بارے میں مولانا عبدالماجد دریابادی نے جو کچھ لکھا ہے اور ماہر القادری مرحوم نے جو یہ لکھا تھا کہ ان کی انگلیاں الفاظ کی نبض پر ہمیشہ رہتی تھیں، تو یہ کس درجہ حقیقت پر مبنی ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے بہت سے خطوط میں زبان کے بہت سے نکتے بیان فرمائے ہیں۔

ایک صاحب نے دریافت فرمایا کہ اگر "رقاص" کا مونث "رقاصہ" درست ہے تو اداکار اور فنکار وغیرہ کی تانیث "اداکارہ" اور "فنکارہ" کیوں درست نہیں؟ مولانا مرحوم کی جانب سے ان کے

پرائیویٹ سکریٹری محمد اجمل خاں نے لکھا کہ۔

"رقاص عربی لفظ اور "اداکار" فارسی ہے۔ فارسی میں مونث مذکر نہیں ہوتا ہے۔ عربی میں "ۃ" لگا کر مونث بناتے ہیں، فارسی میں نہیں۔"

ایک صاحب نے "شکریہ" کے بارے میں دریافت فرمایا۔ انھیں مولانا نے یہ جواب دلوایا

"لفظ "شکریہ" عربی ہے، لیکن اردو میں جو شکریے کا لفظ رائج ہوگیا ہے، وہ ترکیب عربی نہیں ہے۔"

ایک صاحب کو ان کے سوال کے جواب میں یہ لکھوایا۔

"کہاوت کہنا سے نکلا ہے۔ "یہ کہہ بات" نہیں ہے۔ گرامر کے کسی خاص قاعدے سے نہیں بنا۔ محض عرصے تک استعمال کرنے کے بعد یہ معنی پیدا ہوئے ہیں۔"

اسی خط میں مولانا نے ایک بڑے نکتے کی بات یہ فرمائی کہ

"گرامر کے قاعدے زبان بننے کے بہت دنوں بعد بنتے ہیں۔ لہٰذا ہم لفظ کے متعلق بعد میں بنے ہوئے قاعدوں سے انھیں نہیں پرکھ سکتے۔"

برصغیر کے مشہور فلسفی ظفر حسین خاں کی کتاب "انواعِ فلسفہ" دارالمصنفین اعظم گڑھ سے شائع ہوئی تھی۔ مولانا نے اس کی اشاعت پر حکومت سے انعام دلوایا، لیکن ان میں مستعمل انگریزی اصطلاحات کے ترجمے کے بارے میں کئی خطوط میں گفتگو فرمائی اور اپنے خیال کے مطابق ان کی صحیح متبادل اصطلاحات پیش فرمائیں:

خواجہ غلام السیدین مرحوم مولانا آزاد کے "ترجمان القرآن" کا ترجمہ کر رہے تھے۔ اس سلسلے میں انھوں نے فلسفہ والٰہیات کی بعض مصطلحات کی ایک فہرست روانہ فرمائی تھی، مولانا نے ان مصطلحات کی تصحیح فرمائی۔

مولانا ابوالکلام آزاد کے یہ خطوط، ان کی زندگی کے آخری دور کی یادگار ہیں جب کہ بہ قول

شخصے اردو ادب سے ان کا رشتہ ٹوٹ چکا تھا۔ بلاشبہ اس دور کی کوئی اہم تحریر و تخلیق
مرحوم کے قلم سے موجود نہیں۔

بابِ سوم:

لسان الصدق اور اُس کا دائرۂ بحث

نومبر ۱۹۰۳ء میں مولانا ابوالکلام آزادؔ نے کلکتہ سے "لسان الصدق" کے نام سے ایک ماہنامہ جاری کیا تھا۔ اس کے چار مقاصد میں سے تین کا تعلق اردو زبان و ادب کی ترقی سے تھا رسالے کے مقاصد، مولانا آزادؔ کی زبان ہی میں یہ تھے۔

۱۔ سوشل ریفارم، یعنی مسلمانوں کی معاشرت اور رسومات کی اصلاح کرنی۔

۲۔ ترقیِ اردو، یعنی اردو زبان کے علمی لٹریچر کے دائرے کو وسیع کرنا۔

۳۔ علمی مذاق کی اشاعت، بالخصوص بنگالہ میں۔

۴۔ تنقید، یعنی اردو تصانیف پر منصفانہ ریویو کرنا۔

مولانا نے "لسان الصدق کا دستور العمل" کے عنوان سے ان مقاصد کی تشریح اور ان کی اہمیت بھی بیان فرمائی ہے۔ رسالے کا پہلا مقصد چونکہ اصلاحِ معاشرت سے تعلق رکھتا ہے اس لیے اسے نظر انداز کرتے ہوئے بقیہ تین مقاصد کی تشریح مولانا آزادؔ کے الفاظ میں پیش کرتے ہیں۔ ترقیِ اردو، اس مقصد کی وضاحت و تشریح میں مولانا لکھتے ہیں:

ترقی اُردو: "اردو زبان نے آج تک جس قدر علمی ترقی کی ہے، وہ کسی خاص کوشش پر مبنی نہیں ہے۔ مسلمان آج تک اس سے بے خبر رہے اور صرف معمولی طور سے علمی تصانیف اس کے ذخیرے کو وسیع کرتی رہیں۔ غور کیا جائے تو چار زبانیں مشرقی زبانوں میں ایسی ملیں گی جو اردو کے ساتھ شمار کی جاسکتی ہیں۔ ترکی، عربی، فارسی اور بنگلہ۔ یہ وہ

زبانیں ہیں، جنھوں نے جدید اثرات اردو کی طرح اسی آخری دور میں حاصل کیے ہیں۔ ان میں سے تین زبانیں خاص اسلامی ممالک کی زبانیں ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ فارسی نے بہ نسبت اُردو کے کوئی قابلِ ذکر ترقی نہیں کی لیکن ترکی اور عربی زبانوں کے مقابلے میں اگر اردو لائی جائے تو زمین و آسمان کا فرق نظر آئے گا۔ عربی زبان میں جدید علوم و فنون کی جس کثرت سے کتابیں موجود ہیں اور ہر ماہ جس قدر عربی کتابیں ترجمہ ہو کر شائع ہوتی ہیں اسے وہی شخص جان سکتا ہے جو بیروت اور مصر کی موجودہ حالت سے واقف ہو۔ ترکی زبان میں تمام جدید علوم کی کتابیں موجود ہیں اور روز بروز ترقی کرتی جاتی ہیں۔ اُردو میں تو عربی کی دائرۃ المعارف (عربی انسائیکلو پیڈیا) اور "النقش فی الحجر" ہی کا جواب نہیں ہے۔ اس مقابلے سے مقصود یہ ہے کہ اردو ابھی اور مشرقی اسلامی زبانوں سے بہت پیچھے ہے اور اس کی اصلی وجہ یہ ہے کہ علوم و فنون کے ترجمے کا اُردو میں سلسلہ قائم نہیں ہوا اور صرف تعلیم کی جانب اب تک توجہ رہی۔ اس کے علاوہ اُردو میں عمدہ تصانیف کی بھی کمی ہے۔ سوا چند مشہور مصنّفوں کے جن کا نام انگلیوں پر شمار کیا جا سکتا ہے اور کسی قابل شخص کے قلم سے عمدہ تصنیف نہیں نکلتی۔ برخلاف اس کے مخرّبِ اخلاق ناولوں کی اور فضول کتابوں کی اس قدر کثرت ہے کہ شاید فارسی زبان کی کتب عشقیہ نظم و نثر بھی اس کا مقابلہ نہ کر سکیں۔ اس

یں کوئی شک نہیں کہ اس وقت ملک میں کافی تعداد ایسے اہلِ قلم کی موجود ہے جن کی کوششوں سے عمدہ کتابیں تصنیف ہو سکتی ہیں لیکن عام میلان دیکھ کر وہ اس کی توقع نہیں کر سکتے کہ کسی علمی تصنیف کے ذریعے وہ کاپی رائٹ کے قاعدہ سے مستفیض ہو سکیں گے، اس لیے انھیں بجائے مفید کتابوں کے ناولوں میں وقت صرف کرنا پڑتا ہے اور اس طرح اُردو زبان کا علمی دائرہ بجائے وسیع ہونے کے روز بروز تنگ ہوتا جاتا ہے یہ تمام ضرورتیں ایک ایسی انجمن کی منتظر تھیں جو اُردو زبان کی ترقی کے وسائل پیدا کرے اور اہلِ قلم کی مدد کر کے اُن سے علمی خدمت لے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے لٹریری سیکشن کا انجمن ترقی اُردو قائم کرنا واقعی ہمیں امید دلا رہا ہے کہ اس انجمن کی بدولت یہ تمام ضرورتیں رفع ہو جائیں گی اور ہم ایک دن اپنی قومی زبان کو علمی زبانوں کی ہم سری کرتے ہوئے دیکھیں گے۔ لسان الصدق کا دوسرا مقصد "ترقی اُردو" اسی انجمن کے متعلق ہے یہ ان تمام وسائل کو عمل میں لائے گا جو ترقیِ اُردو کے لیے انجمن قرار دے گی۔ بالخصوص بنگالہ میں انجمن کے مقاصد کی اشاعت اور بنگالہ کی اہلِ قلم جماعت کو اس پر متوجہ کرنا، لسان الصدق کا اہم فرض ہے۔"

تنقید: مقصدِ تنقید کے بارے میں مولانا فرماتے ہیں:

انگریزی میں کسی کتاب پر "ریویو" کرنا یہ مفہوم رکھتا ہے کہ اس کتاب کے حسن و قبح پر بحث کی جائے اور ریویو نویس اپنی رائے ظاہر کرے۔ لیکن اُردو میں ہمیشہ

ریویو کا ترجمہ "تقریظ" کیا گیا ہے جس سے ریویو کا اصلی مفہوم ہی مفقود ہوگیا. اس لیے کہ تقریظ تو عام طور پر کسی کتاب کی مدح و تحسین کرنے کا مفہوم رکھتی ہے. برخلاف ریویو کے کہ اس کا مفہوم صرف اس کے حسن ہی پر بحث کرنی نہیں ہے، بلکہ اس کے قبح پر بھی نکتہ چینی کرنی ہے اکثر کتابوں کے آخر میں بعض ہمعصر افاضل کی تقریظیں نظر آتی ہیں جن میں مدح و تحسین سے دو تین صفحے کالے کرنے کے سوا کرٹسزم کے اصول سے ذرا بھی کام نہیں لیا جاتا، تقریظ کا صرف مدح و تحسین کا مفہوم رکھنا یہاں تک مسلّم ہوگیا ہے کہ اگر کسی تقریظ میں کتاب پر کوئی ذرا سا اعتراض کیا ہو یا کتاب کی کسی قدر خرابی ظاہر کی ہو تو وہ تقریظ کے دائرہ ہی سے باہر سمجھ کر اس قابل نہیں سمجھی جاتی کہ کتاب کے ساتھ شائع کی جائے.

سر سید احمد خاں مرحوم نے جب اپنے ابتدائی زمانہ میں آئین اکبری کی تصحیح کی اور اسے طبع کیا تو مرزا اسد اللہ خاں غالب مرحوم سے تقریظ کی فرمایش کی مرزا صاحب یورپ کے جدید آئین کے دلدادہ تھے اور آئینِ اکبری کو ایک فضول کتاب سمجھتے تھے. انھوں نے سر سیدؒ کی خاطر تقریظ تو نظم میں لکھ دی لیکن اظہار رائے سے نہ بچ سکے. تقریظ کا پہلا شعر یہ ہے.

مژدہ یاراں را کہ ایں دیریں کتاب
یافت از اقبالِ سید فتح باب

اس کے بعد انھوں نے انگریزوں کے آئین اور ایجادات

کی تعریف کی ہے اور اس کتاب کی تصحیح میں سرسید نے جو عرق ریزی کی تھی اسے شاعرانہ پہلو سے فضول بتلایا ہے اور چند شعر سرسید کی مدح میں لکھ کر تقریظ ختم کردی ہے۔

سرسید نے جب تقریظ دیکھی تو بہت ناراض ہوئے اور کتاب کے ساتھ شائع نہیں کی اس ناراضی کا اصل سبب یہ تھا کہ سرسید ریویو کے اصلی مفہوم کے عادی نہ تھے، تقریظ میں صرف مدح و تحسین کا ہونا ان کے ذہن نشین تھا۔

"ریویو" کا اصلی ترجمہ ہماری زبانوں میں "تنقید" سے بہتر نہیں ہوسکتا اور ممالکِ اسلامیہ میں ریویو کی جگہ یہی لفظ مستعمل ہے۔ ہندستان کے عام اخبارات میں آجکل جس طریقہ سے کتابوں پر بالعموم ریویو کیا جاتا ہے اسے ریویو کی جگہ تقریظ کہنا چاہیے، نہ کتاب کی پوری کیفیت ظاہر کی جاتی ہے اور نہ اس کے حسن و قبح پر بحث ہوتی ہے۔ صرف مصنف اور جائے طبع اور قیمت کی اطلاع دے دینی ریویو نویسی کا فرض سمجھا گیا ہے۔ ایسے ریویو سے علاوہ اس کے کہ ریویو نویسی کا اہم فرض نہیں پورا کیا جاتا سب سے بڑی یہ خرابی پیدا ہوتی ہے کہ کتاب کے نقائص نہ پبلک پر ظاہر ہوتے ہیں اور نہ مصنف پر، رفتہ رفتہ مصنفین بھی تقریظ کے عادی ہوجاتے ہیں اور پھر وہ کسی کے اعتراض سننے کی قابلیت نہیں رکھتے "لسان الصدق" کا فرض ہوگا کہ وہ ہر کتاب پر اپنی سچی

رائے ظاہر کرے اور جس طرح کتاب کا روشن پہلو
پبلک کے سامنے کر دے اسی طرح اس کے تاریک پہلو
کو بھی پیش کر دے وہ اس کی بالکل پرواہ نہیں کریگا
کہ اس کا مصنف کون ہے؟ اور کس پایا کا ہے؟ وہ
تصنیف گو کیسے ہی با اقتدار اور مشہور شخص کی کیوں
نہ ہو' یہ اس کی سچی خرابیاں ظاہر کر دے گا کیونکہ یہ
لسان الصدق ہے اور سچائی اس کا دستور العمل ہے "۔

علمی مذاق کی اشاعت: یوں تو پورے ملک میں علمی مذاق کی اشاعت مولانا کا مقصد تھا لیکن بنگال میں جس کے مرکز 'کلکتہ' میں مولانا ایک مدت سے مقیم تھے، خاص طور پر علمی مذاق کی اشاعت چاہتے تھے۔ اس سلسلے میں مولانا فرماتے ہیں:

" لسان الصدق کا چوتھا مقصد علمی مذاق کی اشاعت
بالخصوص بنگالہ میں ہے اگرچہ یہ مقصد عمومیت کے
لحاظ سے تمام ہندستان سے تعلق رکھتا ہے لیکن بنگالہ
کی خصوصیت خاص اس صوبہ کے مسلمانوں کی حالت
پر مبنی ہے۔ ہندستان میں تعلیم روز بروز ترقی کرتی
جاتی ہے اور بالخصوص مسلمانوں میں تعلیم یافتہ جماعت
بڑھتی جاتی ہے لیکن باوجود اس کے علمی مذاق جس چیز
سے عبارت ہے اُس کی مسلمانوں میں بڑی کمی ہے زندہ
دلانِ پنجاب ہمارے کلیہ سے کسی قدر مستثنیٰ ہونے کا
استحقاق رکھتے ہیں ورنہ ہندستان کی عام حالت کے
متعلق تو ہمارا اندازہ بہت صحیح ہے علمی مذاق سے ہماری
مراد اخبارات کا مطالعہ، علمی رسائل کی کثرت، مجالسِ
علمی کی شرکت، علمی مباحث کا چرچا ہے جو پنجاب کے

سوا اور کہیں خال خال نظر آتا ہے۔ یہ تو ہمارے مقصد کے عام پہلو کی تشریح تھی بنگال کی خصوصیت کی وجہ یہ ہے کہ یہاں کی اسلامی سوسائٹی اس مذاق سے بالکل معرا ہے اور اگر ہمارے بعض احبابِ بنگالہ اجازت دیں تو ہم یہ ثابت کر سکتے ہیں کہ انھیں اپنی اس غلطی کا احساس بھی نہیں ہے۔ برخلاف مسلمانوں کے اگر اسی صوبہ کے ہندو بنگالیوں کو دیکھا جائے تو زمین و آسمان کی اَن نیچرل تشبیہ نیچرل معلوم ہوگی۔ جو علمی مذاق اور دماغی ترقی ہندوؤں میں نظر آتی ہے۔ اسے دیکھ کر ایک باریک بین نگاہ حیرت میں آجاتی ہے کہ ایک ہی خاک کے دو نوجوان ایک ہی یونیورسٹی سے کامیاب ہو کر نکلتے ہیں، لیکن مسلمان نوجوان کسی خاص شغل کو حاصل کر کے ایسا بےخود ہو جاتا ہے کہ اسے کسی قسم کی علمی تحریک ہوشیار نہیں کر سکتی برخلاف اس کے وہ ہندو جوان باوجودیکہ ایک اعلیٰ درجہ کے کام میں منہمک ہوتا ہے علمی مذاق سے اپنی دماغی قوت کو قوی کرتا ہے اور شب و روز مسائلِ علمی اور مباحثِ فنّی کے مطالعہ میں مشغول رہتا ہے ایسی حالت میں کیا کوئی فزیالوجسٹ ہمیں بتلا سکتا ہے کہ بنگالہ کے مسلمانوں اور ہندوؤں میں کوئی دماغی امتیاز ہے؟ یہ ممکن تھا کہ ہم بلا دریافت کے خارجی امتیاز کی بنا پر دماغی امتیاز بھی تسلیم کر لیتے، لیکن جب ہم انہی بنگالی مسلمانوں میں بعض ایسے گراں مایہ وجود بھی دیکھتے ہیں جن کی علمی قابلیتوں کا تمام انڈیا معترف ہے اور جن کا قابلِ عظمت جوہر اپنی

ملکی زبان میں ظاہر نہیں ہوا ہے بلکہ ایک غیر مانوس علمی زبان میں انھوں نے اپنا سکہ بٹھایا ہے تو ہمارا یہ خیال بالکل غلط ثابت ہوتا ہے اور ہمیں تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ ہندوؤں کی علمی قابلیت کی اصلی وجہ ان کا علمی مذاق ہے جس میں وہ کالج سے نکل کر ہمیشہ مشغول رہتے ہیں اور مسلمانوں کی عدم قابلیت کی حقیقی وجہ مذاق سے بے بہرہ ہونا ہے جس کا انھیں بالکل احساس نہیں ہے۔۔

"لسان الصدق" اپنی کوششوں سے اُن میں پہلے اس کا احساس پیدا کرے گا اور پھر اس مذاق کی اشاعت کریگا اس صوبہ سے کسی علمی رسالہ کا اردو میں نہ نکلنا اس مذاق کے نہ ہونے کی بیّن دلیل تھی، جس کمی کو "لسان الصدق" نے عالمِ وجود میں قدم رکھتے ہی پورا کر دیا اور اسی طرح اپنی اور کوششوں میں بھی کامیاب ہوگا۔ والسّعی منّی والاتمام من اللّٰہِ تعالیٰ۔"

(لسان الصدق ۲۰ر نومبر ۱۹۰۳ء جلد نمبر ۱)

لسان الصدق کے مقاصد کی اس تفصیل و تشریح کے مطالعے سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مولانا آزاد نے اوائلِ عمر اور علمی زندگی کے آغاز ہی میں پختہ علمی، ادبی اور لسانی شعور حاصل کر لیا تھا۔ اس وقت مولانا کی عمر صرف پندرہ برس کی تھی۔ اور اس وقت جو بات انھوں نے کہی تھی، اس سے بلند بات آج تک کسی زبان پر نہیں آئی۔

لسان الصدق کا پہلا شمارہ نومبر ۱۹۰۳ء میں اور آخری، اپریل مئی ۱۹۰۵ء کا مشترک شمارہ تھا۔ اس کی تین جلدیں ہیں۔ تینوں جلدوں کے مجموعی صفحات کی تعداد تقریباً تین سو ہے ان کے مشمولات کی زیادہ تعداد اردو زبان و ادب کے مسائل سے متعلق ہے۔ دوسرے اہلِ قلم کے مضامین کے سوا مندرجہ ذیل مضامین اور نوٹس (NOTES) مولانا آزاد کے قلم سے ہیں:

۱۔ اردو شارٹ ہینڈ رائٹنگ — فروری ۱۹۰۴ء

۲۔ ملکی زبان سے غفلت — " "

۳۔ دارالسلطنت ہند میں ایک عمدہ پریس کی ضرورت — اپریل "

۴۔ اردو انسائیکلو پیڈیا — جون جولائی ۱۹۰۴ء

۵۔ دیسی اور ولایتی الفاظ — اگست ستمبر "

۶۔ ترقیِ اردو اور تراجم علوم و فنون (۱) — " "

" " (۲) — اپریل مئی ۱۹۰۵ء

• اس فہرست میں سب سے پہلا عنوان" اردو شارٹ ہینڈ رائٹنگ" کی ایجاد سے متعلق ایک نوٹ ہے۔ اس نوٹ کے مطابق یہ فن منشی غلام رسول (بمبئی) نے ایجاد کیا تھا۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مولانا کے سامنے اردو کی علمی ترقی ہی کا مسئلہ نہ تھا بلکہ عام اور کاروباری زندگی میں، سرکاری دفتروں میں، اردو کے رواج و نفاذ کا مسئلہ اور اس کی ضروریات بھی تھیں۔ شارٹ ہینڈ سے متعلق مولانا نے علی پور (کلکتہ) سنٹرل جیل میں مجسٹریٹ کے سامنے اپنے مشہور تحریری بیان "قولِ فیصل" میں بھی اظہارِ خیال کیا ہے۔ اس سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ اردو شارٹ ہینڈ کی تاریخ، اس کے ارتقا اور اس فن کے مختلف پہلوؤں پر مولانا کی نظر تھی۔

• دوسرا مضمون مصر کے روزنامہ" المؤید" کے ایک مضمون کا ترجمہ ہے، جس کے شروع میں مولانا نے ایک نوٹ دیا ہے۔ اس میں مولانا نے شکوہ کیا ہے کہ ہمارے نوجوان کئی عالمی زبانوں میں عبور حاصل کرتے ہیں لیکن اپنی ملکی زبان (اردو) سے غفلت برتتے ہیں۔ حالانکہ مہذب دراصل وہی شخص ہے، جو اپنے قومی اور مذہبی لٹریچر کے ساتھ واقف ہو۔ مولانا نے توقع ظاہر کی ہے کہ جدید تعلیم یافتہ نوجوانوں کو اپنی ملکی اور قومی زبان کی تحصیل کی بھی سعی کرنی چاہیے۔

• زبان کی ترقی میں پریس کا جو اہم کردار رہا ہے اور آیندہ بھی اسے جو اہمیت حاصل رہے گی اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ مولانا آزاد کو اس کا شدید احساس تھا۔ اس لیے پریس کی ترقی اور آزادی کے لیے جو کوششیں مولانا نے الہلال کے آغازِ اشاعت (۱۹۱۲ء) سے کی تھیں، وہ الہلال کے دورِ ثانی (۱۹۲۷ء) تک جاری رہیں۔ لیکن پریس کی ترقی اور اس کی اہمیت کا احساس انھیں اس وقت

سے تھا جب وہ صرف چودہ برس کے بھی نہ تھے۔ یہ ان کی غیر معمولی بصیرت اور ذہانت کی دلیل ہے۔ اس کا ثبوت وہ مضمون ہے جو مولانا کے قلم سے مخزن، لاہور (مئی ۱۹۰۲ء) میں "فنِ اخبار نویسی" کے عنوان سے نکلا تھا اور پھر ایک مضمون اس کے دو سال بعد "دار السلطنت ہند میں ایک عمدہ پریس کی ضرورت" کے عنوان سے اپریل ۱۹۰۴ء کے لسان الصدق میں نکلا تھا۔

اردو انسائیکلو پیڈیا کی تحریک کی ایک طویل تاریخ ہے۔ مختلف اوقات میں کئی حضرات نے اس کی تالیف و تدوین کا عزم کیا، لیکن مختلف وجوہ سے یہ بیل منڈھے نہ چڑھ سکی۔ مولانا آزاد نے کئی ایسی تجویزوں اور عزائم کا ذکر کیا ہے۔ اور لکھا ہے۔

> "فی الحقیقت اردو میں انسائیکلو پیڈیا کی اشد ضرورت ہے اور انجمن ترقی اردو کو ضرور اس پر توجہ کرنی چاہیے۔ اس کی ترتیب کے متعلق ایک اور آسان تجویز ہے، جو پیش کردی جائے گی۔"

مولانا کے اس نوٹ سے جو لسان الصدق کے جون جولائی ۱۹۰۴ء کے مشترکہ شمارے میں چھپا تھا، اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ مولانا اپنی علمی و ادبی زندگی کے آغاز ہی سے اردو زبان کی ترقی اور اس کے علمی لٹریچر میں اضافے کے بارے میں سوچتے تھے اور اس کے لیے ان کے ذہن میں تجاویز تھیں۔

باب چہارم :

دیسی اور ولایتی الفاظ

علی محمود (بانکی پور) نے لسان الصدق (اگست ستمبر ۱۹۰۴ء) میں ایک مضمون "زبان کا قانون" کے عنوان سے اشاعت کے لیے بھیجا تھا۔ اس میں بتایا تھا کہ اردو میں انگریزی الفاظ کے کثرتِ استعمال کا رجحان اردو زبان کی شیرینی اور فصاحت کے لیے سخت مضر ثابت ہوگا۔ اس سلسلے میں انھوں نے اردو میں استعمال کیے جانے والے انگریزی الفاظ کی پانچ قسمیں قرار دی تھیں اور مثالوں کے ذریعہ واضح کیا تھا کہ کس قسم کے الفاظ کو اردو میں استعمال کرنا چاہیے اور کس قسم کے الفاظ سے احتراز ضروری ہے۔

اس مضمون پر مولانا آزاد نے "دیسی اور ولایتی الفاظ" کے عنوان سے ایک نوٹ دیا ہے، جو بجائے خود ایک مضمون ہے۔ اس میں مضمون نگار کے پیشِ نظر مقصد سے توافق کیا ہے اور لکھا ہے کہ موصوف کی یہ رائے نہایت مفید اور اس قابل ہے کہ اردو کے سرپرست اس پر کافی توجہ کریں اور اردو کی سادگی و شیرینی میں جو غالب کے خطوط میں پائی جاتی ہے، فرق نہ آنے دیں۔ لیکن اس سلسلے میں مولانا نے یہ سوال بھی اٹھایا ہے:

> "اب دیکھنا یہ ہے کہ ہمارے پاس وہ کونسا معیار ہے جس سے ہم انگریزی کے ان الفاظ میں، جن کا استعمال غیر ضروری ہے اور ان الفاظ میں جن کا استعمال ضروری ہے، ایک حدِ فاصل قرار دے سکیں، کیوں کہ یہ تو ظاہر ہے کہ ایک زبان دوسری زبان سے فائدہ حاصل کرنا چاہے گی تو اس کی علمی اصطلاحات اور وسیع الفاظ کا

اس پر ضرور اثر پڑے گا اور اُن کے استعمال پر مجبور ہو گی۔ اس لیے ایک ایسا معیار ضرور ہونا چاہیے، جس سے ضروری اور غیر ضروری الفاظ میں ہم امتیاز کر سکیں۔"

اس سلسلے میں مولانا نے بعض انگریزی الفاظ اور ان کے متبادلات پر بحث کی ہے اور بتایا ہے کہ اگرچہ انگریزی کے اردو میں متبادل الفاظ مل جاتے ہیں، لیکن ان کی معنوی جامعیت کا بدل ثابت نہیں ہوتے اور ان میں وہ زور پیدا نہیں ہوتا جو بعض انگریزی الفاظ میں موجود ہے پھر ایسے موقعوں پر کیا کیا جائے؟ مثال میں مولانا نے "بیوگرافی اور لائف" گورنمنٹ، کیمسٹری، لٹریچر وغیرہ الفاظ کو پیش کیا ہے اور ان کے اردو متبادل سیرت، سوانح عمری اور حیات، حکومت و دولت دوا سازی اور ادب، ادبی دنیا وغیرہ الفاظ پیش کیے ہیں، نیز ان کے اطلاقات اور اردو میں ان کے مفہوم پر کافی بحث کی ہے۔ یہاں صرف دو مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

۱۔ بیوگرافی کے متعلق مولانا لکھتے ہیں:

"کیا مسٹر موصوف ہم کو اطمینان دلا سکتے ہیں کہ "بیوگرافی" جس مفہوم کو رکھتی ہے، سیرت یا سوانح عمری یا حیات اسی مفہوم کو ادا کر سکتے ہیں؟ سوانح عمری یا سیرت یا حیات جب کہا جائے گا تو سامع کا انتقال ذہنی فوراً اسی سیرت کی طرف ہوگا، جس سے ہمارے قدیم تذکرے اور ابن خلکان جیسے تراجم بھرے پڑے ہیں۔ برخلاف بیوگرافی کے جس کے سنتے ہی ایک نہایت عظیم الشان لائف کی تصویر سامنے آجائے گی۔ یہی وہ خیال ہے جس کو "مخزن" کے قابل ایڈیٹر نے "حیاتِ جاوید" پر ریویو کرتے ہوئے ظاہر کیا تھا کہ "ہم نہیں سمجھے کہ ٹائیٹل پر سوانح عمری کی جگہ سر سید کی لائف کیوں لکھا گیا ہے"۔ لیکن انھوں نے اس پر ذرا بھی غور نہیں کیا کہ "حیاتِ جاوید"

پر سوانح عمری اور سیرت کا اطلاق ہو سکتا ہے یا لائف
اور بیوگرافی کا ؟"

۲ ۔ کیمسٹری کے بارے میں مولانا لکھتے ہیں :

" بعض الفاظ ایسے ہیں کہ اگرچہ اردو میں ان کے لیے کافی الفاظ موجود ہیں، لیکن قائل الفاظ کے جس مفہوم کو سامع کے ذہن نشین کرانا چاہتا ہے، اُردو الفاظ اس مفہوم کو ادا کرنے سے قاصر ہیں۔ اور ممکن ہے کہ بجائے اصل مفہوم کے سامع ان الفاظ سے کسی دھوکے میں پڑ جائے، مثلاً انگریزی کا ایک لفظ کیمسٹری CHEMISTRY ہے۔ جس مخزن سے انگریزی میں یہ لفظ آیا ہے، اسی مخزن سے عربی میں، اور پھر عربی سے اردو میں کیمیا آیا ہے۔ اب دیکھو! اگر کیمیا کا لفظ استعمال کیا جاوے تو ممکن نہیں کہ اس سے سامع علم کیمسٹری کا وسیع مفہوم سمجھ سکے، بلکہ اس کا خیال مشرق کی اس غلط فہمی کی طرف جائے گا، جس کا نام کیمیا رکھا گیا ہے۔ برخلاف اس کے اگر کیمسٹری کا لفظ استعمال کیا جائے تو وہ غلط فہمی کبھی پیدا نہیں ہو سکتی۔"

مولانا ابوالکلام آزاد کے ان افادات سے ہم یہ نتیجہ بھی نکالتے ہیں کہ وہ ہر انگریزی اصطلاح کے اردو ترجمہ اور متبادل کی تلاش کو ضروری نہیں سمجھتے تھے بلکہ ان کے نزدیک مناسب تھا کہ مروّج و مستعمل انگریزی الفاظ و اصطلاحات کو جن کے مفہوم سے عوام و خواص کا ذہن آشنا ہو گیا تھا اصل کے مطابق اردو رسم الخط میں استعمال کر لیا جائے۔

بابِ پنجم :

ترقیِ اردو اور تراجمِ علوم و فنون

مولانا ابوالکلام آزاد نے ایک طویل مضمون " ترقیِ اردو اور تراجمِ علوم و فنون کا سلسلہ" کے عنوان سے لسان الصدق (اگست ستمبر ۱۹۰۴ء و اپریل مئی ۱۹۰۵ء) کی دو قسطوں میں شائع کیا تھا۔ اس مضمون میں اِس سوال کا جواب دیا گیا تھا کہ اردو زبان ایک علمی زبان کا درجہ کیوں کر حاصل کر سکتی ہے؟ اس سلسلے میں انھوں نے عالمی علمی زبانوں سے مختلف علوم و فنون کے تراجم کی ضرورت کو واضح کیا ہے اور متفرق کوششوں کو ناکافی بتاتے ہوئے اردو زبان کی ترقی اور اسے علمی زبان بنانے کے لیے علوم و فنون کے تراجم کے باضابطہ اور مستقل نظام کی ضرورت پر روشنی ڈالی ہے اور لکھا ہے کہ جدید علوم کے ہر صیغے میں مبسوط اور جامع کتابیں ترجمہ کی جائیں اور علوم و فنون کا کوئی پہلو یورپ کی زبانوں میں ایسا نہ ہو، جس کا اردو میں ترجمہ موجود نہ ہو۔ مولانا کے خیال میں جب تک ایسا منظم سلسلہ قائم نہ کیا جائے گا، اردو کی ترقی محال ہے۔ مناسب ہوگا کہ علمی تراجم کے باب میں مولانا کے افکار کا مطالعہ انھی کی زبان میں کیا جائے۔ مولانا فرماتے ہیں:

> " اردو زبان ایک ایسے زمانے میں پیدا ہوئی جب کہ اسلامی علوم و فنون کی ترقی کا دور ختم ہو چکا تھا اور تنزل کی بنیادیں مضبوط ہو گئیں تھیں۔ اس نے ایک ایسی سوسائٹی میں پرورش پائی جو علوم و فنون سے بالکل بے خبر تھی اور اپنی بے بہا زندگی بے فکری اور لاابالی کی نذر کر چکی تھی۔ آنکھ کھول کر اس نے جس کو دیکھا، اسی حالت میں مست دیکھا۔ سوسائٹی ہی کا یہ اثر تھا کہ اسے بچپن ہی سے

عشق و محبت کی چاشنی پسند آگئی تھی اور اپنے شباب کا زمانہ اس عشق و محبت کے جذبات میں صرف کر دیا۔

ہندستان کی سلطنت میں جب انقلاب ہوا اور ایک متمدن قوم نے سلطنت کی باگ اپنے ہاتھ میں لی تو اس کی علمی زبان کا بھی اردو زبان پر اثر پڑنے لگا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ وہ علمی صورت سے روشناس ہوئی۔ اسی تمدنی اثر سے اخبارات جاری ہوئے، کتابیں لکھی گئیں، لوگوں کو جدید علوم کا شوق ہوا، انگریزی سے کتابیں اردو میں ترجمہ کی گئیں۔ اَرِ جنل مضامین پر بھی علمی طریقے سے کتابیں تصنیف کی گئیں۔ غرضے کہ اردو جس گہری نیند میں سو رہی تھی، اس سے ایک کروٹ لی، زمانے کی ضرورتوں سے واقف ہوئی اور آج تک کچھ نہ کچھ ترقی کرتی گئی۔

لیکن درحقیقت نہ تو چند اخبارات سے یہ علمی زبان بن سکتی ہے اور نہ ان ترجموں سے جو متفرق طور پر شائع ہو رہے ہیں، اردو زبان ترقی کر سکتی ہے اور علمی زبان بن سکتی ہے۔ بلکہ اس میں باضابطہ علوم و فنون کا سلسلہ قائم کیا جائے جدید علوم کے ہر صیغے میں بسوط اور جامع کتابیں ترجمہ کی جائیں۔ علوم و فنون کا کوئی پہلو یورپ کی زبانوں میں ایسا نہ ہو، جس کا اردو میں ترجمہ موجود نہ ہو۔ جب تک اردو میں ایسا منظم سلسلہ قائم نہ ہوگا، اس کی ترقی محال ہے۔...

آج دنیا میں یورپ کی زبانوں کا دور دورہ ہے، یہی علمی زبانیں ہیں، یہی علوم و فنون کے مخزن ہیں، یہی آج علمی دنیا کے ماوا و ملجا تسلیم کیے جاتے ہیں۔ اس لیے جس

طرح عربی یونان و فارس کے سرچشموں سے سیراب ہوئی تھی، اردو کو یورپ سے فیض یاب ہونا چاہیے۔

اس کی سب سے عمدہ مثال ممالکِ اسلامیہ میں مل سکتی ہے جہاں وہ عربی جو کسی زمانے میں ارسطو اور افلاطون کی تحقیقات سے فائدہ اٹھاتی تھی، آج بیکن اور نیوٹن کی ایجادات سے مالامال ہو رہی ہے۔ مصر اور قسطنطنیہ میں ابتدا سے تعلیم کے ساتھ تراجم کا سلسلہ قائم کیا گیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عربی اور ترکی میں علومِ جدید کا ایک بہت بڑا ذخیرہ جمع ہو گیا۔ سائنس کی کوئی شاخ بمشکل ایسی ملے گی جس میں کوئی کتاب عربی میں ترجمہ نہ کی گئی ہو۔ شام کے عرب عیسائیوں نے اور بالخصوص بیروت کے ڈاکٹر کرنیلیکوس نانڈیک جو شام کا ایک مشہور عربی مترجم و مصنف تھا اور جسے انتقال کیے ہوئے تھوڑا عرصہ ہوا ہے، اس نے علاوہ اور سائنٹی فک مضامین کے ایک ایسا عمدہ سلسلہ عربی میں مرتب کر دیا ہے، جس کے دیکھ لینے سے سائنس کی تمام شاخوں پر ایک اجمالی نظر ہو جاتی ہے۔ اس کا نام "النقش فی الحجر" ہے اور آٹھ جلدوں میں شائع ہوا ہے۔ اسی طرح پطرس بستانی بیروت کا ایک مشہور مصنف گزرا ہے، جس نے سب سے بڑا کام یہ کیا ہے کہ عربی میں ایک بسیط انسائیکلو پیڈیا کی بنیاد ڈالی، جو درحقیقت موجودہ زمانے کی ایک علمی درجے کی طرز تصنیف ہے۔ اس کی چار جلدیں اس نے خود اپنی زندگی میں شائع کیں تھیں اور چھ جلدیں اس کے بعد اس کے بیٹے اور پوتے

نے شائع کیں۔ اب تک اس کی صرف گیارہ جلدیں شائع ہوئی ہیں اور ابھی حرفِ "ع" تک مضامین پہنچے ہیں۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ کس جامعیت اور بسط کے ساتھ لکھی گئی ہے۔

ان مصنفین کے علاوہ علی پاشا مبارک، رفاعہ بک، محمود پاشا، احمد فارس، یوحنا ابکادیوس وغیرہ مصر و قسطنطنیہ اور بیروت کے مشہور مصنف اور مترجم گزرے ہیں جنھوں نے اپنی گراں مایہ کوششوں سے عربی میں علوم و فنون کا عمدہ ذخیرہ جمع کر دیا ہے، جو ہمیشہ وسیع ہوتا رہے گا۔

جو لوگ وہاں کی علمی حالت سے واقف ہیں وہ سمجھ سکتے ہیں کہ ان ترجموں سے قوم کو اور قوم کی زبان کو کتنا عظیم الشان فائدہ حاصل ہوا ہے۔ روز بروز کتابیں ترجمہ کی جا رہی ہیں، اخبار و رسائل جدید معلومات کی اشاعت میں سرگرمی سے کوشش کر رہے ہیں۔ ان تراجم کی بدولت اب قوم میں خود بھی تصنیف و تالیف کا مادہ پیدا ہو چلا ہے اور بڑے بڑے اہم مسائل پر بجائے ترجمہ کے لوگ تصنیف کی طرف متوجہ ہو گئے ہیں:

.... جب کہ ہم کہہ چکے ہیں، کسی زبان کے علمی زبان ہونے کے لیے دو باتیں ضروری ہوتی ہیں، ایک اس کا ذاتی سرمایہ دوسرے علمی زبانوں کے تراجم۔ اردو کا جو کچھ سرمایہ ہے، ظاہر ہے۔ کوئی زبان صرف اس لیے علمی زبان تسلیم نہیں کی جاتی کہ اس میں میر و میرزا یا دبیر و انیس کی سی اعلیٰ شاعری موجود ہے۔ بلکہ اس لیے کہ اس میں علوم و فنون

> کا حصہ قابلِ قدر پایا جاتا ہے۔ آج انگریزی کو مشرقی زبانوں پر لاطینی سن یا ملٹن کی وجہ سے فوقیت نہیں ہے، بلکہ سپیکس، نیوٹن ؟ اور ڈارون جیسے فلاسفروں کی وجہ سے۔
>
> پس اگر ہم اردو کو ایک علمی زبان بنانا چاہتے ہیں، تو ہمارا فرض یہ ہے کہ یورپ کی علمی زبانوں کا سرمایہ ترجمہ کر کے اردو میں جمع کریں۔ ورنہ اس ضرورت سے چشم پوشی کر کے شیکسپیر کے ڈراموں اور رینلڈ کے ناولوں کا ترجمہ کرنا دنیا کو اپنی جہالت پر خود ہنسوانا ہے۔"

اس مضمون کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا آزاد کے سامنے اردو زبان میں علمی تراجم کی پوری تاریخ تھی۔ وہ اس بات میں سرسید کے افکار کے نشیب و فراز، اردو میں علمی تراجم کی تحریک کا آغاز، سرسید کی اولیت اور ان کا کارنامہ پھر سرسید کی جانب سے خود ہی اس کی مخالفت اور ان کے پیشِ نظر مخالفت کے مصالح سے بخوبی واقف تھے۔ مولانا آزاد نے سرسید کے دور میں ان کے پیشِ نظر مصالح کی معقولیت کا اعتراف اور ان کا دفاع کیا ہے۔ لیکن مولانا نے اپنے زمانے میں تراجم علمی کی تحریک اور نظریے کی پرزور وکالت کی ہے۔ اس میں انھوں نے سرسید کی اس مخالفت کے پس منظر پر بھی روشنی ڈالی ہے جو انھوں نے پنجاب اور الٰہ آباد کی یونی ورسٹیوں میں مشرقی زبانوں کے ذریعے تعلیم کی کی تھی۔ مولانا فرماتے ہیں:-

> "یہ خیال (علوم و فنون کے تراجم کا) کوئی نیا خیال نہیں ہے سب سے پہلے ایسٹ انڈین کمپنی نے ایک سوسائٹی اردو میں ترجمہ کرنے کے لیے قائم کی تھی، جس نے چند کتابیں ترجمہ کر کے شائع بھی کیں۔ پھر ۱۸۶۶ء میں سرسید مرحوم نے سائنٹی فک سوسائٹی اسی خیال سے قائم کی تھی اس سوسائٹی نے بھی بعض عمدہ کتابیں اردو میں ترجمہ کر

کے چھاپیں۔ لیکن ۱۸۷۰ء میں جب سرسید انگلینڈ کے سفر سے واپس آئے تو ان کے دماغ نے جس میں آکسفورڈ اور کیمبرج کا نقشہ جما ہوا تھا، تراجم علوم و فنون کے سلسلے کو قبل از وقت اور تعلیمی ضرورتوں کے لحاظ سے فضول سمجھا سوسائٹی کو توڑا اور علی گڑھ کالج کی بنیاد ڈالی۔

اس میں تو کوئی شک نہیں کہ جس زمانے میں اور جن قومی ضرورتوں کے لحاظ سے سرسید نے ایسا کیا تھا، وہ بہت ٹھیک اور بجا کیا۔ بیشک جب کہ قوم میں تعلیم نام کو نہ ہو، تعلیم کی خوبیوں سے بالکل بے خبر ہو، تو ایسی حالت میں ایک ریفارمر کا سب سے پہلا فرض یہ ہے کہ قوم کو تعلیم کی طرف متوجہ کرے اور اس زبان سے واقف کرے۔ جب مخزنِ علوم و فنون سے، تعلیم سے، قوم کا دماغ روشن ہو گا تو گورنمنٹ کے طریقِ سلطنت اور منشائے قانون سمجھنے کی لیاقت پیدا ہو گی، تہذیب و شائستگی سے واقف ہو گی اور علمی درجے کے عہدوں کا استحقاق پیدا ہو گا۔ لیکن جب کہ قوم میں تعلیم پھیل رہی ہے، خیالات روشن ہو رہے ہیں اور وہ مشکلات دور ہو گئیں ہیں، جن کا سرسید کو سامنا تھا، تو ایسی حالت میں تراجم علوم و فنون کا سلسلہ جو زبان اور قوم کی حقیقی خدمت ہے، کیوں نہ جاری کیا جائے؟ تو م اگر تعلیم سے قابل ہو ئی ہے، تو قوم کی زبان کو علم سے کیوں نہ قابل کیا جائے''؟

اس کے بعد مشرقی زبانوں کے ذریعے تعلیم اور علوم و فنون کے تراجم کی مخالفت کے باب میں سرسید کے افکار کا دفاع کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"سرسید کی زندگی میں بعض ایسی مخالفتیں پائی جاتی ہیں، جن سے یہ خیال ہو سکتا ہے کہ سرسید ترجمہ کے سخت مخالف تھے اور قوم کے لیے صرف تعلیم کو پسند کرتے تھے۔ ۱۸۸۱ء میں جب ڈاکٹر لائٹز کی کوششوں سے، جو مشرقی علوم کے بڑے حامی تھے، پنجاب یونیورسٹی قائم ہونے لگی تو مشرقی علوم اور تراجم علوم کا فضول ہونا متعدد دلائل سے ثابت کیا۔ اسی طرح جب ۱۸۸۹ء میں الہ آباد یونی ورسٹی اسی خیال پر قائم ہوتی نظر آئی تو سرسید نے پھر اس خیال کی مخالفت میں ایک پرجوش آرٹیکل شائع کیا اور اس اصول کو قوم کے لیے سخت مضر قرار دیا۔ ان واقعات سے بعض لوگوں کو دھوکا ہوا ہے کہ سرسید نفسِ ترجمہ کی ضرورت کے مخالف تھے اور اس کو قوم کے لیے ایک فضول کام سمجھتے تھے۔ لیکن یہ سخت غلطی ہے جس نے سرسید کی اعلاغرض پر پردہ ڈال دیا ہے۔

سرسیدؒ نے جب سائن ٹی فک سوسائٹی کے بعد کالج کو قائم کیا تھا، تو انھوں نے اس امر کو تسلیم کرلیا تھا کہ قوم کی ترقی انگریزی تعلیم کی اشاعت پر موقوف ہے اور درحقیقت ان کا یہ خیال صحیح تھا۔ انھوں نے آخر عمر تک انگریزی تعلیم کی حمایت کی اور اس کو وہ قوم کی سچی حمایت سمجھتے تھے۔ پنجاب یونی ورسٹی یا الہ آباد یونیورسٹی جب قائم ہونے لگی تو سرسیدؒ کو معلوم ہوا کہ بانیانِ یونی ورسٹی نے بجائے انگریزی تعلیم کے صرف مشرقی علوم

اور مشرقی زبانوں کی تعلیم کا کورس جاری کرنا چاہا ہے۔ اور انگریزی تعلیم سے مسلمانوں کو محروم کرنے کا ارادہ کیا ہے بیشک یہ خیال سرسید کے لیے سخت تکلیف دہ تھا۔ انھوں نے اس کی سخت مخالفت کی۔ اس مخالفت کا مقصد صرف یہی تھا کہ ہائی ایجوکیشن کے سلسلے کو توڑ کے اس کی جگہ صرف مشرقی علوم اور تراجم کا سلسلہ قائم کرنا، درحقیقت قوم کو برباد کرنا ہے۔ کیوں کہ جب وہ اس تعلیم سے جو ان تمام ترقیات کی جڑ ہے محروم رہے تو صرف تراجم سے کیا فائدہ حاصل ہو سکتا ہے۔ تراجم تب ہی مفید ہو سکتے ہیں جب کہ قوم تعلیم اور تعلیم کی خوبیوں سے اچھی طرح واقف ہو جائے اور تعلیم سے خود مستفیض ہو اور اپنی زبان کو فیض یاب کرنے کے لیے آمادہ ہو۔

غرضے کہ سرسید صرف تراجم کے 'بغیر سلسلہ تعلیم کے' مخالف تھے۔ اور اس کو قوم کے لیے سخت مضر سمجھتے تھے کہ تراجم کی طرف متوجہ ہو کر تعلیم کو بالکل چھوڑ دیا جائے۔ اس سے یہ سمجھنا کہ سرسید نفسِ ترجمہ کے مخالف تھے یا ترجموں کے ذریعے علوم کی اشاعت کو فضول اور ترقیِ قومی کے لیے مضر سمجھتے تھے، تغیر القول بما لا یرضیٰ بہٖ قائلہٗ

اس سلسلے کی ایک ضروری بحث رہ گئی اور وہ ہے علامہ شبلی مرحوم کی مخالفتِ تراجم علوم وفنون! مناسب ہو گا یہ پوری بحث مولانا آزاد کی زبانی سُنی جائے۔ مولانا فرماتے ہیں:

"تراجمِ علوم وفنون کے متعلق اگرچہ ہم تمام بحثیں طے کر چکے ہیں، لیکن ابھی ایک مخالف رائے پر بحث کرنا باقی ہے جو قوم کے ایک فاضل اور باوقعت مصنف کے قلم سے نکلی

ہے۔ شمس العلما مولانا شبلی نعمانی نے اپنے مشہور مضمون "گزشتہ تعلیم مسلمانان میں" قدیم تراجمِ علوم پر بحث کرتے ہوئے، ایک طویل فہرست ان کتابوں کی دی ہے جو خلفائے عبّاسیہ کے زمانے میں سنسکرت اور یونانی وفارسی سے ترجمہ کی گئیں تھیں۔ ان واقعات پر ریمارک کرتے ہوئے وہ تراجمِ علومِ جدیدہ کے متعلق لکھتے ہیں:

" انھیں واقعات پر خیال کرنے سے بانیان سائن ٹی فک سوسائٹی، علی گڑھ کو دھوکا ہوا۔ اور وہ سمجھے کہ جس طرح ہمارے مورثوں نے بذریعۂ ترجمہ علوم کو ترقی دی، ہم بھی یورپ کے علوم وفنون کو اپنی زبان میں ترجمہ کرکے اپنے عوام اور اپنی قوم کو ترقی کے رتبے پر پہنچادیں گے، مگران کا یہ خیال غلط اور قیاس مع الفارق تھا۔

اوّل تو ترجموں کا اہتمام اور لاکھوں روپے کا صرف جو خلفائے عباسیہ کے زمانے میں ہوا، اب غیر ممکن ہے۔

دوسرے اس زمانے میں علوم محدود تھے اور ترقی رک چکی تھی۔ جس قدر کتابیں ترجمہ کی گئیں، یونانیوں کے علوم پر گویا احاطہ کرلیا گیا۔ اس زمانے میں نہ علوم کی ترقی کی انتہا ہے، نہ ان کتابوں کے شمار کی حد ہے، جن کی تصنیف برابر جاری ہے۔

تیسری بڑی غلطی اس قیاس میں یہ ہے کہ اس زمانے میں عربی زبان، جس میں ترجمے ہوئے، تمام ممالکِ اسلامیہ میں حکومت کرنے والی زبان تھی۔ دنیا میں ایسی کوئی مثال موجود نہیں ہے کہ قوم نے اس زبان میں علوم وفنون

کو ترقی دی ہو، جو اس پر حکومت کرنے والی نہیں ہے۔
مگر ہم کو اس بات کے معلوم کرنے سے نہایت خوشی ہوئی
کہ خورشید احمد خاں صاحب نے جو سائن ٹی فک کے بانی ہیں،
متعدد تحریروں میں اس غلطی کا اعتراف کیا ہے۔"

چنانچہ پچھلے دنوں اسی خیال سے ہم نے مولانا [شبلی] کی خدمت میں ایک خط ارسال کیا اور اس امر کی تحقیق کرنی چاہی۔ ہمیں نہایت ہی مسرت ہوئی، جب کہ مولانا نے ہماری رائے سے اتفاق ظاہر کیا اور سلسلۂ تراجم علوم کو قوم کی اصل خدمت تحریر فرمایا۔ مولانا کے خط کا وہ حصہ بجنسہٖ درج ذیل ہے:

مکرم!

آپ کا دل چسپ والا نامہ پہنچا۔۔۔

ترجمے کا میں مخالف نہیں ہوں۔ "گزشتہ تعلیم" میں سرسید نے مجھ سے وہ عبارت بجبر لکھوا دی تھی۔ میں نے سخت انکار کیا تھا، لیکن ان کا اصرار غالب آیا۔

میں تو ترجمے کو اصل علمی خدمت سمجھتا ہوں۔ بلکہ ان شاء اللہ اس کا ایک باضابطہ رشتہ قائم کروں گا۔

شبلی

۲۳ مارچ ۱۹۰۳ء"

آخر میں مولانا آزاد نے شبلی و سرسید کی اس مخالفت کی حقیقت پر ان الفاظ میں تبصرہ کیا ہے:

"مولانا [شبلی] کے اس اختلاف کی حقیقت یہ ہے جو انھوں نے اس خط میں ظاہر فرمائی ہے۔ سرسید کو ہائی ایجوکیشن کی حمایت میں جو جوش پیدا ہوا تھا، وہ تراجم کے سلسلے کا سخت مخالف تھا۔ انھیں خوف تھا کہ کہیں تعلیمی ضرورتوں سے بالکل چشم پوشی نہ کر لی جائے۔ اور صرف تراجم کے سلسلے کو قائم کرنا قوم کی علمی ترقی کے لیے کافی سمجھ لیا جائے۔ یہی خیال ان کو بار بار آمادہ کرتا تھا کہ وہ اس امر کو زور

کے ساتھ ظاہر کریں اور قوم کی تمام طاقت پہلے تعلیم کی طرف متوجہ کرالیں۔ اسی خیال کا اثر تھا کہ "گزشتہ تعلیم" میں مولانا کے قلم سے بھی مخالفت ظاہر کرائی گئی۔ ورنہ درحقیقت مولانا کی رائے وہی ہے، جو انھوں نے اس خط میں ظاہر کی ہے۔ بہرکیف یہ رائے کسی کی ہو، ہمیں اس پر ایک نظر ضرور ڈال لینی چاہیے اور دیکھنا چاہیئے کہ تراجم کی ضرورت پر اس رائے کا کہاں تک اثر پڑ سکتا ہے۔"

اس کے بعد مولانا نے علامہ شبلی مرحوم کے ان تمام دلائل کا بہ تفصیل رد کیا ہے، جو انھوں نے اردو یا مشرقی زبانوں میں تراجم کے خلاف پیش کیے تھے۔ پہلے اعتراض کے متعلق، مولانا آزاد فرماتے ہیں:

"اس رائے میں پہلی وجہ یہ ظاہر کی گئی ہے کہ ترجموں میں لاکھوں روپیوں کا صرف ہے جو رہنمائے خلفائے عباسیہ نے کیا تھا۔ اس کا ہونا اس زمانے میں غیر ممکن ہے۔" لیکن اس وجہ کو ظاہر کرتے ہوئے اس امر پر غور نہیں کیا گیا کہ اس زمانے میں کتابوں کا حاصل کرنا، ان کا ترجمہ کرانا، تراجم کی تصحیح، ان کی اشاعت درحقیقت بہت بڑے صرف کی محتاج تھی اور بلاشبہ اگر حکومت کا ساتھ نہ ہوتا تو کبھی عربی ان علوم سے فیض یاب نہ ہوتی، لیکن اب زمانے کی ترقی اور حالتوں کے انقلاب نے اور صورت پیدا کردی ہے۔ آج ہر علم وفن کی کتابیں اتنے روپیوں میں مل سکتی ہیں جو اس زمانے میں، قلم و دوات اور کاغذ کے صرف کے لیے کافی نہ ہوتے۔ علم نے آج تجارت کی صورت اختیار کرلی ہے۔ ہر شخص اپنی قابلیت سے کام لے کر بڑے بڑے ترجمے کرسکتا ہے اور اہلِ مطبع کو معقول صلے

پر دے سکتا ہے، جس کے ذریعے سے کتابیں چھپ کر فوراً شائع ہو سکتی ہیں۔ اگر تھوڑی سی رقم لے کر کوئی شخص اس امر کا اعلان کر دے کہ اسے ایسے مترجموں کی ضرورت ہے، جو عمدگی سے انگریزی کتابوں کا اردو میں ترجمہ کر سکیں تو کم از کم بیس تیس آدمی اسی وقت مہیا ہو سکتے ہیں اور معمولی اجرت پر ترجمہ کر کے دے سکتے ہیں۔ جس شخص نے ترجمہ کیا اس کو معقول اجرت ملتی ہے، جس نے ترجمہ کرایا وہ اسے چھاپ کر سیکڑوں روپے حاصل کر سکتا ہے۔ آج کل سلسلۂ تراجم میں لاکھوں روپیوں کی اور خلفائے عباسیہ کے سے سرپرستوں کی کیا ضرورت ہے؟ انجمن ترقی اردو نے ہربرٹ اسپنسر جیسے فلاسفر کی اہم تصنیف "ایجوکیشن" کا مکمل ترجمہ صرف تین ساڑھے تین سو روپیوں میں کرایا ہے جسے چھاپ کر اس سے دگنا نفع حاصل کر سکتی ہے۔"

۲۔ دوسرے اعتراض کا جواب دیتے ہوئے مولانا لکھتے ہیں

"دوسری وجہ یہ بتائی ہے کہ "اس زمانے میں علوم محدود تھے۔ اس لیے اردو کتابوں میں ترجمہ کر لینا بالکل آسان تھا۔ آج یورپ کے علوم روز بروز ترقی کر رہے ہیں اور ان کتابوں کی کوئی انتہا نہیں ہے جو علوم کے متعلق شائع ہوتی ہیں۔ اس لیے غیر محدود علوم محدود کتابوں میں کیوں کر جمع ہو سکتے ہیں۔"

اعتراض معقول ہے لیکن یہ پوچھنا چاہیے کہ اگر علوم روز بروز ترقی کر رہے ہیں تو کیا مترجمین کی تعداد میں

روز بروز تنزل ہوگا؟ تعلیم پھیل رہی ہے اور تعلیم یافتہ جماعت روز بروز وسیع ہو رہی ہے۔ اس لیے نئی کتابوں کا ترجمہ بھی ہمیشہ ہوتا رہے گا۔ اس کے علاوہ ہم اردو میں علوم کی کتابیں جمع کرنا چاہتے ہیں، نہ یہ کہ یورپ کے بحرِ ذخار کو اردو کے کوزے میں بند کرنا چاہتے ہیں۔ اردو میں علوم کی ہر شاخ میں چند جامع کتابوں کا ترجمہ کر لینا یا تالیف کر لینا کافی ہے۔ اس کے بعد علمی ذوق خود اردو میں علوم کا سرچشمہ جاری کر دے گا۔"

۳۔ تیسرے اعتراض کے جواب میں مولانا فرماتے ہیں:

"تیسری وجہ یہ پیش کی ہے کہ "اس زمانے میں عربی زبان جس میں ترجمے کیے گئے تھے تمام ممالکِ اسلامیہ میں حکومت کرنے والی زبان تھی۔ اس کی کوئی مثال نہیں مل سکتی کہ قوم نے اس زبان میں علوم و فنون کو ترقی دی ہو، جو اس پر حکومت کرنے والی نہیں ہے۔" اس اعتراض کے جواب میں اگرچہ ہم کوئی مثال ایسی پیش نہ کر سکیں، لیکن موجودہ زمانے کے قومی عروج سے ہم کو ضرور اس امر کا یقین ہو سکتا ہے کہ جب سلطنت کی مدد کے بغیر آج صرف قوموں کی کوشش سے بڑے بڑے تعلیمی اور ملکی کام ہو رہے ہیں، تو اس امر کے ماننے میں کیا تامل ہو سکتا ہے کہ قوم کی کوشش سے اس زبان میں جو سلطنت کی زبان نہیں ہے، علمی ترقی ہو جائے۔ یورپ میں جو کچھ علمی ترقی نظر آ رہی ہے یہ تمام قومی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ حکومت کو اس سے کوئی تعلق

نہیں۔ آکسفورڈ، کیمبرج جیسی مشہور یونی ورسٹیاں رعایائے
سلطنت کی بنائی ہوئی ہیں۔ کیا دنیا میں اس سے پیشتر
اس کی نظیر مل سکتی ہے کہ صرف رعایا کی کوشش سے کوئی ملک
متمدن ہو جائے؟ خود اسلامی سلطنتوں میں ہم دیکھتے ہیں کہ
کالجوں کا قائم کرنا، علوم کا مدون کرنا اور تمام علمی کام حکومت
ہی کی کوشش سے سرانجام پاتے تھے جس طرح اس کی
مثالیں نہیں مل سکتیں، اسی طرح ہم کو اس کی مثال بھی نہیں
ملتی کہ قوم نے اس زبان میں ترقی کی ہو جو حکومت کی
زبان نہیں ہے۔ لیکن جس طرح زمانے کے انقلاب سے پہلی
صورت پیدا ہو گئی ہے، یہ بات کچھ حیرت انگیز نہیں کہ
دوسری صورت بھی پیدا ہو جائے۔"

(لسان الصدق۔ اگست ستمبر ۱۹۰۴ء)

مولانا آزاد کا یہ مضمون (ترقیِ اردو اور تراجم علوم و فنون کا سلسلہ) جس کے کئی حوالے گزشتہ صفحوں میں پیش کیے جا چکے ہیں، لسان الصدق میں دو طویل قسطوں میں شائع ہوا تھا۔ پیش کردہ تمام حوالے اس کی پہلی قسط (اگست ستمبر ۱۹۰۴ء) سے مقتبس تھے۔ دوسری قسط (اپریل مئی ۱۹۰۵ء) میں مولانا نے انجمن ترقی اردو جو اس وقت آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا صرف ایک شعبہ تھی، کے کام پر (جو اس وقت تک صرف چند تالیف و تراجم تک محدود تھا) تبصرہ کیا ہے اور مستقبل میں اس کے لیے تراجم اور تالیف و تدوینِ علوم و فنون کے بعض کاموں کی نشان دہی فرمائی ہے۔

باب ششم:

اصطلاحات سازی

مولانا ابوالکلام آزاد اردو میں علوم و فنون کے تراجم، تالیف و تدوین اور اوریجنل تصانیف کے بہت بڑے مؤید اور داعی تھے۔ وہ اس حقیقت کا بھی کامل شعور رکھتے تھے کہ اردو میں علوم و فنون کی ہر قسم کی تصنیفات و تالیفات کے لیے اصطلاحات ناگزیر ہیں۔ کسی زبان کی ترقی، اس کی جامعیت اور علمی معیار کا دار و مدار اس زبان میں علمی اصطلاحات کے کم و بیش سرمائے پر ہوتا ہے۔ اس حقیقت پر شروع ہی سے مولانا کی نظر تھی۔ البتہ الہلال میں انھوں نے اس موضوع پر تفصیل سے بحث کی ہے اور اصطلاحات سازی کے اصول و قوانین اور اس کے مختلف اطراف پر توجہ دلائی ہے۔

اردو میں علوم و فنون کے تراجم اور تالیف و تدوین میں بلاشبہ ہزارہا علمی اصطلاحات اردو میں منتقل ہو چکی تھیں، لیکن اصطلاحات سازی کی کسی منظم تحریک کے آغاز کا نام و نشان نہ تھا۔ الہلال نے اصطلاحات سازی کی منظم تحریک پیدا کی اور اس کے اصول و قوانین کو متعین کرنے کی کوشش کی۔

اردو اصطلاحات سازی کی دوسری منظم تحریک جامعہ عثمانیہ (حیدرآباد دکن) کے قیام کے فیصلے نے پیدا کی تھی۔ اس ایک فیصلے نے اصطلاحات سازی کے اصول و قوانین پر سوچنے والوں کی ایک جماعت تیار کر دی، جس کا سرخیل مولوی عبدالحق اور مولوی وحیدالدین سلیم پانی پتی تھے اور علوم و فنون کے تراجم اور علمی موضوعات پر اردو میں تالیف و تدوین کے اس نئے دور کا آغاز جامعہ عثمانیہ ہی کے سلسلے سررشتہ تالیف و ترجمہ کے قیام سے ہوا۔

الہلال نے اصطلاحات سازی کی جو تحریک پیدا کی تھی، اس کے خاص ارکان میں مولانا عبداللہ

العمادی، ابوالمکارم عبدالوہاب اور سید سلیمان ندوی تھے۔ مولانا ابوالکلام آزادؔ اس تحریک کے بانی اور اصل محرک تھے۔ چونکہ تحریک کو مولانا عبدالماجد دریابادی کے ایک اختلاف نے منتظم کر دیا تھا، اس لیے انھیں اس تحریک میں خاص اہمیت حاصل تھی۔ لیکن آخرالذکر شخصیت کے سوا تمام حضرات نہ صرف اردو کے ادیب تھے بلکہ عربی کے اسکالر بھی تھے۔ اس لیے ان کے ذہن میں اور ان کی زبان اور قلم پر عربی اصطلاحات آئیں اور انھیں ان اصطلاحات کی ثقالت کا بالکل احساس نہ ہوا۔ مولانا دریابادی کو اگرچہ عربی سے واقفیت تھی لیکن برائے نام، اس لیے ان کی زبان اور قلم پر سہل اور رواں اصطلاحات جاری ہوئیں۔ لیکن اصطلاحات سازی کا کوئی اصول اور قانون ان کے سامنے نہ تھا۔ صاحبِ الہلال کا ذہن اس بارے میں بالکل صاف تھا۔ انھوں نے اس مسئلے پر سوچا تھا۔ اصطلاحات کے اصول ومبادی سے ان کا ذہن آشنا اور ذوق پختہ تھا۔ جب انھوں نے اپنے افکار کو کاغذ پر منتقل کیا تو وہی اصولِ فن کا معیار قرار پائے۔ اصطلاحات سازی کی اس تحریک پر پوری پون صدی کے شب و روز گزر چکے ہیں اور آغاز کے مقابلے میں ایک عظیم انقلاب پیدا ہو گیا ہے۔ اب نہ صرف دورِ اوّل کے مقابلے میں، بلکہ دوسرے دور (دارالترجمہ کے زمانے) کے مقابلے میں بھی زیادہ سہل، عام فہم اور زبان و قلم پر سہل التلفظ اور رواں ہو گئی ہیں! لیکن اس تحریک کو اس مقام تک پہنچانے میں الہلال کا جو حصہ ہے اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

وضعِ اصطلاحات کے لیے مولانا آزادؔ کے سامنے کیا اصول اور کیا طریقۂ کار تھا؟ اس کی وضاحت میں صرف ایک مثال پیش کر دینا کافی ہوگا۔ الہلال میں "غرائب الافلاک: اَو ملکوت السماوات، صفحۃٌ من علم الافلاکِ الحدیث" کے عنوان سے ایک نہایت اہم مقالہ مولانا کے قلم سے نکلا تھا۔ اس میں وہ لکھتے ہیں:

"ترقیِ آلات کی ایک مثال وہ آلہ ہے جس کو "رنگ نُما"،

SPECTRA SCOPE کہتے ہیں"

اس جملے پر مولانا کے قلم سے ایک حاشیہ ہے۔ اور اسی ایک حاشیے سے مولانا آزادؔ کے اس اصول و طریقِ کار کا پتا چل جاتا ہے، جو اصطلاحات سازی اور انگریزی یا کسی اور زبان سے اصطلاحات کے ترجمے میں ان کے سامنے تھا۔ مولانا لکھتے ہیں:

"یہ نام دو لفظوں سے مرکب ہے، ایک اسپیکٹرا SPECTRA

اور دوسرا اسکوپ (SCOPE) اسپیکٹرا جمع ہے اسپیکٹرم SPECTRUM کی، جو ایک لاطینی نژاد کلمہ ہے۔ اسپیکٹرم کے لغوی معنی ہیں "وہ مختلف رنگ جو آنکھ بند کرنے کے بعد نظر آتے ہیں۔ مگر اصطلاح میں نور کے ان رنگوں کو کہتے ہیں، جو ایک مثلث آلے کے ذریعے سے جسے PRISM کہتے ہیں، جدا کر کے اس طرح دکھائے جاتے ہیں، گویا وہ کسی جالی پر پھیلا دیئے جاتے ہیں۔ اسکوپ کے معنی ہیں "نما"۔ پس اسپیکٹرا اسکوپ کے معنی ہوئے "الوانِ نور نما"۔ اور یہی اس آلے کی تعریف ہے۔

لیکن "الوانِ نور نما" کی ترکیب طویل و ثقیل تھی۔ اگر نور، حذف کر دیا جائے اور الوان کو رنگ سے بدل دیا جائے تو یہ "رنگ نما" ہو سکتا ہے۔ یہ ترکیب سبک و سہل ہے اور بہ آسانی زبانوں پر جاری ہو سکتی ہے۔ اس لیے میں نے صرف "رنگ نما" کو اختیار کیا۔ البتہ اس صورت میں معنی لغوی معنی اصطلاحی سے کسی قدر عام ہوں گے، مگر تداول اور استعمال سے، اس نقص کی تلافی ہو جائے گی اور تھوڑے عرصے کے بعد "رنگ نما" سے بھی اسی طرح خاص آلہ متبادر ہونے لگے گا، جس طرح کہ آج خوردبین، دوربین، مرغ بادنما وغیرہ سے خاص خاص آلات ہی متبادر ہوتے ہیں۔"

(الہلال، کلکتہ۔ ۷/۱۴، جنوری ۱۹۱۴ء، ص ۱۵)

مقتدرہ قومی زبان کی سائنسی و تکنیکی اصطلاحات میں اسپیکٹرم اور اسپیکٹرا کو "طیف" اور "طیوف" کہا گیا ہے اور اسپیکٹرا اسکوپ کے لیے "طیف بین" کی اصطلاح استعمال کی گئی ہے۔ اس پر

بحث کی ضرورت نہیں۔ یہ یک نظر محسوس کر لیا جا سکتا ہے کہ "طیف بین" کے مقابلے میں "رنگ نما" کی اصطلاح زبان کے لیے سبک و سہل اور ثقالت سے خالی ہے۔ لیکن وہ اب چونکہ رواج پا چکی ہے، اس لیے اب وہی معیار ہے۔ یہ بھی مولانا ہی کے ایک بیان کا مفاد ہے۔

اس ترکیب کے سلسلے میں مولانا نے جو کچھ فرمایا ہے۔ اس سے اصطلاح سازی کے ایجابی، سلبی وغیرہ جو اصول معلوم ہوتے ہیں، وہ یہ ہیں:

الف : سلبی:

۱۔ ترکیب طویل نہ ہو

۲۔ الفاظ ثقیل نہ ہوں

ب : ایجابی:

۱۔ ترکیب سبک و سہل ہو

۲۔ الفاظ ایسے ہوں جو زبانوں پر بہ آسانی جاری ہو سکیں

ج : تداول و استعمال:

یعنی کسی اصطلاح کا رواج پا جانا اور عام استعمال میں آنے لگنا، اس کی معنوی کمی کو پورا کر دیتا ہے اور اس سے وہی مفہوم مراد لیا جانے لگتا ہے، جو کسی لفظ کے وضاحتی ترجمے یا عبارت کے ایک ٹکڑے سے لیا جاتا ہے۔

اس مقام پر جو بات مولانا آزاد کے ایک حاشیے کے مطالعے سے دلالتاً ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے، اس بات کو مولانا نے وضاحتاً اپنے الفاظ میں بھی بیان فرما دیا ہے۔ مولانا لکھتے ہیں:

> "ضرور ہے کہ وضع و تسمیۂ صطلاحات میں عربی زبان کے ثقیل، مغلق اور نادر الاستعمال الفاظ استعمال نہ کیے جائیں کہ یہ خود عربی کے لیے بھی بار ہیں، پھر دوسری فروعی زبان کا کیا سوال۔

(۲) الفاظ مصطلحہ حتی الوسع مختصر اور چھوٹے ہوں جو زبانوں پر بہ آسانی رواں ہو سکیں۔ بڑے بڑے فقروں کو الفاظِ مصطلحہ قرار دینا خلافِ آئینِ وضعِ اصطلاح ہیں:

(۳) اکثر حضرات وضعِ اصطلاح میں اس بات کی کوشش کرتے ہیں کہ دوسری زبان میں اس اصطلاح کا جس قدر مفہوم ہے وہ بتمامہٖ اردو میں منتقل کرلیا جائے اس سے دو نتیجے پیدا ہوتے ہیں، یا تو ان کو اردو کی قلت ثروت اور تنگ دامانی کی شکایت ہوتی ہے کہ اس میں ادائے مفہوم کی قدرت نہیں، جیسا کہ احباب اس کے شاکی ہیں اور یا پھر حسبِ وسعتِ مفہوم الفاظِ کثیرہ میں اپنا مفہوم ادا کرنا پڑتا ہے۔ سب سے پہلے اس پر غور کرنا چاہیے کہ اصطلاح کی حقیقت کیا ہے؟ اصطلاح کی تعریفِ صحیح ہے کہ ایک جماعت کا کسی خاص وسیع مفہوم کے بار بار ادا کرنے کے لیے ایک مختصر و مناسب لفظ کا فرض کرلینا، جس کے بولنے سے حسبِ فرض و وضع وہ مفہوم ذہن میں آسکے۔

پس اگر اس اصطلاحِ مفروض کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے الفاظ سے اپنے مفہوم کے تمام معانی و مطالب ادا کردے تو وہ پھر اصطلاح کہاں ہوئی، وہ تو عام گفتگو کا ایک ٹکڑا ہے خود انگریزی اصطلاحات پر غور کیجیے، وہ جن معانی کی طرف اشارہ ہیں: ان کے الفاظ کب ان سب کو محیط و جامع ہیں؟ اس کی مثالیں آپ کو تمام اصطلاحات میں موجود ملیں گی۔ پس درحقیقت الفاظِ اصطلاحات ہم کو مفہومِ لغوی نہیں سمجھاتے، بلکہ محض فرض اور وضع و تسلیم عام سے عبارت ہیں۔

(۴) سب سے آخر یہ کہ جن السنۂ اصولیہ سے آپ الفاظ مستعار لے رہے ہیں، ان کے قواعد و قوانینِ لسانیہ کی رو سے وہ صحیح ہوں۔ مولانا نے اصطلاح کی تعریف کے بیان کرنے اور اصول کی طرف رہنمائی کردینے ہی پر اکتفا نہیں فرمایا، بلکہ ان اصول و قوانینِ اصطلاح سازی کے نمونے بھی پیش فرمادیئے ہیں۔ میں یہاں چند اصطلاحات سے متعلق مولانا کے افکار پیش کروں گا؛ مولوی ابو المکارم عبدالوہاب نے بعض انگریزی اصطلاحات اور ان کے اردو ترجمے پیش کیے تھے۔ ان میں سے بعض اصطلاحات پر مولانا آزاد نے بحث فرمائی ہے۔ لکھتے ہیں:

> "OSTEOLOGY" "علم ماہیۃ العظام" کی جگہ "علم العظام"
> کافی ہے ماہیت کی تخصیص کی ضرورت نہیں اور نہ اصل
> اصطلاح میں کوئی لفظ ایسا ہے۔"

۲۔ NEUROLOGY "علم باحوال الاعصاب" میں "احوال" بے کار ہے کہ یہ خود سمجھ میں آجاتا ہے۔ پس "علم الاعصاب" جیسا کہ خود انگریزی میں ہے، کافی ہے۔

۳۔ ORGANOLGY کے لیے "علم الاعضاء البشر والحیوانات والنباتات" ایک نہایت طویل ترکیب ہے۔ "علم الاعضاء" کفایت کرتا ہے۔ اعضاء میں "اعضائے انسان وحیوانات ونباتات داخل ہیں۔

۴۔ METRONOMY "علم وزن الاوقات" صحیح نہیں۔ وزن اشیائے ثقیلہ کا ہوتا ہے، وقت کا نہیں۔ البتہ تقدیر کہہ سکتے ہیں۔ یعنی "علم تقدیر الاوقات"۔ مگر عربی میں پہلے سے اس کے لیے "علم المواقیت" کا لفظ موجود ہے۔"

(الہلال، کلکتہ۔ ۱۵ اکتوبر ۱۹۱۳ء، ص ۱۵)

آج کل جس شکل میں کوئی اصطلاح ہمارے سامنے آتی ہے، یقین رکھنا چاہیے کہ آغاز میں اس کی یہ شکل ہرگز نہ ہوگی۔ اصطلاحات کی ابتدائی حالات سے لے کر ان کے آخری تعینات واستقرار تک کی ایک تاریخ ہے۔ مثلاً: عربی میں پہلے "علم اصولِ معالجۃ العیون" کی ترکیب بہ طورِ اصطلاحات استعمال ہوئی۔ پھر اصول کو حذف کر کے "علم معالجۃ العیون" کی ترکیب مستعمل ہوئی۔ آخر میں صرف "علم العیون" کی اصطلاح رہ گئی اور اسی میں "اصولِ معالجہ" کے معنی کو بھی مضمر تسلیم کرلیا گیا۔ اسی طرح "علم اعضاء البشر والحیوانات والنباتات" کی جگہ اب صرف "علم الاعضاء" مستعمل ہے اور اردو میں تو صرف ایک لفظ "عضویات" اس پورے مفہوم کے لیے کافی قرار پایا ہے۔ اسی طرح "علم طبائعِ الطیور" کے بالآخر "علم الطیور" اور اردو میں "طیوریات" کافی سمجھا گیا۔ اس قسم کی ہزارہا مثالیں ہیں۔ بلکہ شاید ہی کوئی اصطلاح ایسی ہو جو اپنے وضع کے اوّل روز سے آج تک یکساں حالت میں استعمال ہوئی ہو۔

اسی قسم کی تاریخ انگریزی اور دیگر تمام زبانوں کی اصطلاحوں کی ہونی چاہیے. آج جس شکل میں انگریزی اصطلاحات ہمارے سامنے آتی ہیں، ان کے اِس شکل تک پہنچنے کی ایک پوری تاریخ ہے۔

باب ہفتم

طریقِ طباعت

موجودہ مشینی دور میں طباعت کی سہولت اور کام میں تیز رفتاری کے لیے مولانا آزاد نہایت ضروری سمجھتے تھے کہ اردو طباعت کے لیے ٹائپ اختیار کرلیا جائے۔ یہی طریق مشینی دور کے تقاضوں سے مناسبت رکھتا ہے۔ مولانا کے نزدیک اردو کی ترقی کے لیے بھی یہ ایک ناگزیر عمل ہے اور جتنی دیر یہ فیصلہ کرنے میں لگے گی، ترقیِ اردو کا سفر رکا رہے گا۔ ان کے اسی اذہان نے انھیں شروع ہی سے الہلال کو اردو میں نکالنے پر مجبور کیا تھا۔

لیکن ٹائپ سے مولانا کے ذوق کی ابتدائی تاریخ پر بھی ایک نظر ڈال لینی چاہیے، جو قدیم بھی ہے اور دلچسپ بھی۔ یہ واقعہ ۱۹۰۱ء، ۱۹۰۲ء کا ہے جب سر سیّد احمد خاں پر حالیؔ مرحوم کی تصنیف 'حیاتِ جاوید' مولانا کی نظر سے گزری تھی اور اس کے بعد تہذیب الاخلاق، علی گڑھ گزٹ اور سرسید مرحوم کی کتب و رسائل ان کے مطالعے میں آئے تھے اور چوں کہ بیشتر چیزیں ٹائپ میں بھی شائع ہوئی تھیں، اس لیے مولانا نے بہ سعی ان کے ٹائپ ایڈیشن حاصل کیے۔ مولانا نے خود ٹائپ سے اپنے ذوق کا تذکرہ کیا ہے۔

اگرچہ یہ بات وثوق سے نہیں کہی جاسکتی کہ مولانا نے اس وقت جدید مشینی دور کے تقاضوں، اردو کی ترقی اور تیز رفتار کارگزاری کے نقطۂ نظر سے ٹائپ کی اہمیت کا اندازہ بھی کرلیا تھا۔ یقین ہے کہ اس وقت وہ تہذیب الاخلاق، علی گڑھ گزٹ وغیرہ کی صاف ستھری اور خوبصورت چھپائی سے متاثر ہوئے ہوں گے۔ لیکن تیرہ چودہ سال کی عمر میں ٹائپ کی چھپائی سے دلچسپی لینا اور پتھر کی چھپائی پر اسے ترجیح دینا بھی کوئی معمولی بات نہیں۔ ٹائپ کی چھپائی سے اپنی دلچسپی اور اس کے پس منظر کے بارے میں مولانا فرماتے ہیں:

"سر سیّد کی تصنیفات کا شوق بتدریج اس طرح دل

د دماغ پر چھا گیا کہ اب کوئی تصنیف ان کی تصنیف کے سامنے آنکھوں میں نہیں جچتی تھی۔ شوق نے ارادت و عقیدت کی شکل اختیار کر لی، اور یہ ہوا کہ ایک عقیدت مند کی طرح جو اپنے شیخ و مرشد کے ملفوظات کے ایک ایک لفظ کو دل و جان دے کر خریدنا چاہے، ان کی تصنیفات کا ہر ورق و صفحہ میں نے نہایت جد و جہد کر کے حاصل کیا۔ سرسیّد کی تصنیفات سے مجھے ٹائپ کے چھاپے سے ایک ذوق پیدا ہو گیا، اور چونکہ سرسیّد کی کتابیں پہلے ٹائپ میں چھپی ہیں، اور بعض بعض پھر لیتھو میں بھی نقل ہو گئیں۔ اس لیے میری کوشش یہ رہی کہ ہر کتاب کا ٹائپ ہی کا ایڈیشن حاصل کروں۔ تفسیر اور مجموعۂ تصنیفاتِ احمدیہ کے علاوہ جن میں تبیین الکلام اور خطباتِ احمدیہ ہیں، میں نے تہذیب الاخلاق کی تینوں اشاعتوں کی مکمل فائلیں بھی منگوائیں۔ پہلی اشاعت سات سال تک رہی ہے۔ اس کی بعض جلدیں ڈیوٹی شاپ میں نہیں تھیں، میں نے کوشش کر کے اور فی جلد پچیس روپے قیمت دے کر اسی کے توسط سے حاصل کیں۔ پھر خیال ہوا کہ ان کے بہت سے مضامین علی گڑھ گزٹ اور سائنٹی فک سوسائٹی کے اخبار میں بھی، جو ان کے سفرِ یورپ کے بعد تک جاری رہا، نکلے ہوں گے۔ نہایت گراں قیمت دے کر ان کی فائلیں بھی حاصل کیں اور سرسیّد کے انتقال تک علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کی جتنی فائلیں مل سکیں، وہ بھی منگوائیں۔ مقصود یہ ہے کہ سرسیّد کی

تصنیفات سے شوق نہیں بلکہ عشق ہوگیا تھا۔ اور
طبیعت کو اس تصور سے بھی صدمہ ہوتا تھا کہ ان
کے قلم سے نکلا ہوا کوئی لفظ ہے اور میرے پاس نہیں۔"
(آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی، دہلی ۱۹۵۸ء ص ۵۳-۲۵۲)

سرسید کی ٹائپ میں مطبوعات نے مولانا آزاد کے ذوق کی تعمیر میں جو حصّہ لیا تھا، یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ ۱۹۱۲ء میں مولانا نے الہلال ٹائپ میں نکالا تھا اور یہ فیصلہ کرکے انھوں نے ہزار ہا روپے کا نقصان برداشت کیا تھا۔

یہ بات بھی واضح کر دینا ضروری ہے کہ مولانا نستعلیق کتابت کے مخالف نہ تھے۔ نستعلیق کتابتِ فنونِ لطیفہ میں مسلمانوں کی روایت کا ایک شعبہ ہے۔ اس میں مسلمانوں کے ذوقِ جمال کا لطیف اظہار ہوا ہے۔ اسے اس حیثیت سے بھی باقی رکھنا تھا، اسے ترقی بھی دینی تھی اور طباعت میں بھی اس کی ضرورت باقی رہنی تھی۔ ٹائپ کے فروغ سے نستعلیق کتابت اور خوش نویسی کا فنِ لطیف ختم نہیں ہو سکتا تھا۔ لیکن اردو کی ترقی اور اس کے وسیع رواج اور مشینی دور میں اس میں تیز رفتار کارگزاری کے لیے ٹائپ کا اختیار کرنا ناگزیر ہے۔ مولانا فرماتے ہیں:

"آج کوئی زبان ترقی نہیں کر سکتی۔ اگر وہ ترقی یافتہ طریقِ طباعت نہیں رکھتی۔ طباعت کی ترقی اور تکمیل بغیر اس کے ممکن نہیں کہ حروف کی چھپائی اختیار کی جائے پتھر کی چھپائی میں محدود رہ کر اردو کی طباعت کبھی ترقی نہیں کر سکتی۔

ہندی اور ہندستان کی تمام زبانوں نے نیز عربی، فارسی ترکی تینوں سامی زبانوں نے حروف کی چھپائی اختیار کر لی ہے۔ اور ان کی طباعت یورپ کی طباعت کا مقابلہ کر رہی ہے۔ کیوں اُردو زبان بھی ایسا نہ کرے جو اسی رسم الخط میں لکھی جاتی ہے۔" (الہلال کلکتہ۔ ۱۵ جولائی ۱۹۲۷ء ص)

الہلال اس وقت اردو ٹائپ میں چھپتا تھا اس کے علاوہ عربی کا بہترین خطِ نسخ بھی موجود تھا۔ مولانا کے خیال میں کوئی بھی اختیار کر لیا جائے، لیکن " اردو کی ترقی کے لیے پتھر کی چھپائی (لیتھو طریقِ طباعت) سے اپنی زبان کو نجات دلانا ضروری ہے "۔ (ایضاً)

مولانا آزاد نے الہلال نکالا تو اس کے لیے ٹائپ ترکی منگوایا تھا، لیکن اردو کے عام اور رائج الوقت ٹائپ کے مقابلے میں یہ اپنے خانوں کی ترتیب اور تعداد میں بالکل مختلف تھا۔ اردو ٹائپ کے اوپر نیچے دو کیس ہوتے ہیں، جب کہ ترکی ٹائپ کے چار کیس تھے۔ اور اس کے استعمال کے لیے اردو کے کمپوزیٹروں کو کوئی مشق نہ تھی۔ انھوں نے جو صفحات کمپوز کیے تھے، وہ سب غلط تھے۔ اس لیے صرف ابتدائی دو صفحے ترکی ٹائپ میں چھاپے گئے اور باقی تمام پرچہ اردو کے مروجہ ٹائپ میں چھپا تھا۔ الہلال (۱۹۱۲ء) کے دوسرے شمارے میں ایڈیٹوریل نوٹس کے ذیل میں " ٹائپ " کے مسئلے پر مولانا نے بہت تفصیل کے ساتھ اظہارِ خیال کیا ہے۔ اور ترکی، مصر اور ہندستان میں ٹائپ کے طریقِ طباعت کی پوری تاریخ بیان کر دی ہے۔ اس میں ہندستان میں لیتھو پریس کے رواج و مقبولیت کا پس منظر بھی بیان کیا ہے۔ اور ٹائپ میں آغازِ طباعت کی بعض مشکلات کا ذکر بھی کیا ہے۔ لیکن بے محل بھی قرار دیا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں:

> " یہ بے معنی عذرات ہرگز اس درجہ اہم نہ تھے کہ محض ان کی وجہ سے ایک زبان کے پریس پر (کہ آغازِ عہد ہی سے دوچارِ مشکلات ہیں) ترقی کی راہیں مسدود کر دی جائیں۔ علی الخصوص ایسی حالت میں کہ اس کی تمام ہمسایہ اور متقابل زبانیں " ٹائپ " کا سہارا پا کر برسوں کی راہ آگے بڑھ جانے کے لیے اپنے پر ہلا رہی ہیں۔
>
> البتہ یہ ضرور ہے کہ بہ تفصیل وہ خصوصیات بتلا دی جائیں، جن کی وجہ سے ٹائپ کو لیتھو کے پریس پر ترجیح

حاصل ہے، اور جن کے بغیر کسی زبان کا پریس اپنے ابتدائی
عہدِ طفولیت سے آگے نشو ونما نہیں پا سکتا۔"

(الہلال، کلکتہ۔ ۲۰ر جولائی ۱۹۱۲ء، ص)

۱۹۲۷ء میں مولانا نے طریقِ طباعت کے سلسلے میں قارئین الہلال کو اپنی آرا پیش کرنے کی جو دعوت دی تھی۔ اس کے نتائج کا ظہور ۱۲ اگست (۱۹۲۷ء) سے شروع ہوگیا تھا اور ۹ر دسمبر (۱۹۲۷ء) کے شمارے تک جاری رہا، جو دورِ ثانی کے الہلال کے خاتمے کی تاریخ تھی۔ اس بارے میں کل ۲۱۰۲ مراسلات موصول ہوئے جن کی آرا کی تقسیم حسبِ ذیل تھی:

۱۔ عربی حروف کے حق میں	۲۵۵
۲۔ موجودہ مشترک طباعت کے حق میں	۸۰۲
۳۔ پتھر کی چھپائی کے حق میں	۳۲۰
۴۔ اردو حروف کے حق میں	۵۳۵
۵۔ حروف کے حق میں، بہ شرطے کہ نستعلیق ہوں	۱۹۰

ان آرا کے سلسلے میں یہ وضاحت بھی ضروری ہے:

۱۔ عربی حروف سے مراد وہ نسخ ٹائپ ہے، جس کا نمونہ مولانا نے پیش کیا تھا۔
۲۔ موجودہ مشترک طباعت سے مقصود یہ تھا کہ الہلال اس زمانے میں کچھ ٹائپ میں اور کچھ لیتھو میں چھپتا تھا۔ اس رائے کے موئیدین چاہتے تھے کہ الہلال اسی طرح نکلتا رہے تاآنکہ اردو قارئین کا ذوق کسی ایک طریقِ طباعت کے حق میں قطعی فیصلہ کر دے۔
۳۔ پتھر کی چھپائی سے اشارہ لیتھو کے عام طریقِ طباعت کی طرف ہے۔
۴۔ اردو حروف سے مراد وہ نسخ ٹائپ ہے، جس میں الہلال دورِ اوّل میں مکمل اور دورِ ثانی میں جزوی طور پر چھپتا تھا۔
۵۔ پانچویں رائے سے مقصود یہ تھا کہ ٹائپ منظور ہے، بہ شرطے کہ نسخ کے بجائے نستعلیق کا ہو۔

۱۹۱۲ء میں مولانا آزاد نے الہلال نکالا تھا تو اس کے لیے کوشش کے باوجود مطلوبہ

تعداد میں ترکی کے کارخانہ ہائے حروف سازی کا ٹائپ میسر نہ آسکا تھا۔ اور جو کچھ میسر آیا تھا اس کی کمپوزنگ کی مشکلات پر قابو نہ پاسکنے کی وجہ سے ہندستان میں مروّج ٹائپ ہی استعمال کیا تھا۔ یہ ٹائپ جس خط نسخ میں تھا، وہ عربی کے بجائے فارسی ٹائپ تھا، جب کہ مولانا کے نزدیک ترکی روش کا ٹائپ زیادہ موزوں اور خوشنما تھا۔

۱۹۲۰ء کے بعد (۱۹۲۷ء سے قبل) مولانا آزاد نے اردو ٹائپ کے مسئلے کو ایک اور انداز سے بھی دیکھا تھا۔ وہ ترکی کے (بنے ہوئے) عربی ٹائپ کو استعمال کر کے خطِ طباعت کی وحدت سے وحدتِ و تقویمِ امت کا کام بھی لینا چاہتے تھے۔ چنانچہ ترکی کے عمر رضا کو انھوں نے جو خط لکھا تھا، اس میں فرماتے ہیں:

"ایک عرصے سے میرا خیال ہے کہ تمام عالمِ اسلامی کے خطِ طباعت کی وحدت کے لیے سعی کرنا وقت کی مہمات میں سے ہے۔ کیوں کہ مقوماتِ امّت میں سے ایک اہم ترین چیز زبان اور خط کی وحدت بھی ہے"

اسی خط میں مولانا لکھتے ہیں:

"ہندستان میں لغت ہندیہ[1] جو عربی، فارسی اور ترکی کی پیداوار ہے، بہت ترقی کر چکی ہے، لیکن اب تک اس کی طباعت خطِ نستعلیقِ فارسی میں محدود ہے اور ٹائپ کی جگہ سنگی مطابع سے کام لیا جاتا ہے۔

میں نے ۱۹۱۶ء میں الہلال ٹائپ میں نکالا تھا، لیکن وہ ٹائپ یہیں کا تیار کردہ تھا۔ اس لیے خطِ نسخ عربی کی جگہ خطِ نسخ فارسی کا تھا۔ اب میں چاہتا ہوں کہ ترکی کی طرح ہندستانی (اردو) کے لیے بھی ترکی کا ٹائپ

---

[1] لغت ہندی سے مراد اردو یا ہندستانی زبان ہے۔ شاہجہاں پوری

استعمال کیا جائے۔

بلاشبہ یہ ضروری ہے کہ ابتدا میں وہ مقبول نہ ہوگا اور خسارے کا متحمل ہونا پڑے گا۔ لیکن میں اس کے لیے تیار ہوں۔

جرمنی اور امریکا میں خط عربی کا لینوٹائپ اور اورٹایپوگراف مشین بن گئی ہے۔ یعنی، وہ مشین جس میں بہ یک وقت حرف ڈھلتا اور مرتب ہو جاتا ہے۔ اور اس طرح ہر مرتبہ نیا حرف میسر آجاتا ہے۔ لیکن چونکہ ہمارا مقصد حروفِ عربیۂ ترکیبہ کی اشاعت ہے، اس لیے ضروری ہے کہ اس کے ڈھالنے کی فونڈری یہاں بنائی جائے۔ جب تک ایسا نہ ہوگا، اس کی اشاعت نہ ہو سکتی ہے۔

یہ ادارہ کسی سیاسی مقصد سے نہیں ہے۔ تجارتی فواید اس کام میں مل سکتے ہیں، جس کی ملک میں طلب ہو۔ لیکن یہ چیز ایسی ہے، جو یہاں مطلوب ہونے کی جگہ بہ کلّی غیر مقبول و مطرود ہے۔

مقصد صرف یہ ہے کہ اتحادِ شعبِ امّت اور وحدتِ مسلمین کے لیے ہندستان کو بھی حروف عربیۂ ترکیبہ کے سلسلے میں منسلک کر دیا جائے۔ اگرچہ اس راہ میں کتنا ہی نقصان ہو۔"

(مکاتیبِ ابوالکلام آزاد، مرتبہ ابوسلمان شاہجہاں پوری)

اردو کی ترقی کے لیے مولانا کے نزدیک ٹائپ کے ذریعے طریقِ طباعت کی جو اہمیت تھی اس کا اندازہ اس سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ دسمبر ۱۹۳۹ء میں انجمن ترقی اردو کے زیرِ اہتمام "کل ہند اردو کانفرنس۔ دہلی" کے موقع پر جو پیغام بھیجا تھا، وہ اسی طریقِ طباعت کے اختیار

سے متعلق ہے۔ مولانا نے اپنے پیغام میں فرمایا تھا۔

"اردو چھپائی کے لیے ٹائپ کی ضرورت فی الوقت سب سے اہم ہے، کانفرنس کو اس کی سفارش کرنی چاہیے کہ اردو کے اخبارات و رسائل نسخ کا ٹائپ اختیار کریں۔"

(مکاتیبِ ابوالکلام آزاد، مرتبہ ابو سلمان شاہجہاں پوری)

بابِ ہشتم

اُردو رسمُ الخط

اردو رسم الخط کا مسئلہ بھی مولانا آزاد کی توجہ فرمائی سے محروم نہ رہا۔ اردو ہندی کے تنازع میں جب ایک حلقے کی طرف سے ناگری رسم الخط اور ایک مرحلے میں رومن رسم الخط اختیار کر لینے کا مشورہ دیا گیا تو مولانا نے اس کی مخالفت کی۔ مولانا کے نزدیک اردو رسم الخط کی تاریخ ہے، اس کی مخصوص روایت ہے، اس کے بعض خصائص ہیں جو اس کے مخصوص فارسی رسم الخط ہی میں نمایاں ہو سکتے ہیں۔ مسلمانوں کے ذوقِ جمال اور حسِ لطیف کا اس کے ذریعے اظہار ہوتا ہے۔ کسی زبان کا رسم الخط اس زبان کے بولنے والوں کی تہذیب اور ذوق کا مظہر ہوتا ہے۔ ان کے نزدیک رسم الخط کی بعض مشکلات یا اس کی کوئی خامی جن کا پروپیگنڈا بڑے زور و شور سے کیا جاتا ہے، ان کی کوئی حقیقت نہ تھی۔ ان کے خیال میں اگر کسی دوسرے رسم الخط کے مقابلے میں اردو کے رسم الخط میں کوئی خامی ہے تو اس کے مقابلے میں اس کی خوبیاں زیادہ ہیں۔ اس لیے کسی خامی کی موجودگی ترکِ رسم الخط کی دعوت کی دلیل نہیں بن سکتی۔

بعض حضرات اردو رسم الخط اور اردو املا کے مسئلے کو بھی ملا دیتے ہیں۔ حالانکہ یہ دونوں چیزیں بالکل الگ الگ ہیں۔ اس لیے بعض اردو الفاظ کے املا میں کسی بے قاعدگی کو فارسی رسم الخط کے ترک کے لیے وجہِ جواز نہیں بنایا جاسکتا۔

اردو رسم الخط کی خوبیوں پر مولانا کی نظر تھی، لیکن اس کا نقص بھی ان کی نظر سے پوشیدہ نہ تھا۔ مولانا غلام رسول مہرؔ مرحوم نے "نقشِ آزادؔ" کے آخر میں مولانا کے جو افادات مرتب کر دیئے ہیں، ان میں ایک افادہ لاطینی اور اردو رسم الخط کے بارے میں بھی ہے۔ مولانا فرماتے ہیں:

" یہ عجیب بات ہے کہ چلتی ریل میں انگریزی لکھیے تو

کوئی دقت محسوس نہیں ہوتی۔ لیکن اردو لکھیے تو لکھا
نہیں جاتا اور حرکتِ قلم چلنے نہیں دیتی۔ جو لوگ سامی
رسم الخط کے مخالف ہیں، وہ اگر چاہیں تو اپنے دلائل
میں اس نئی دلیل کا بھی اضافہ کرلیں۔

بات یہ ہے کہ عربی (فارسی) رسم الخط میں دوائر
بنتے ہیں، محض اوپر نیچے ہونے والی لکیریں نہیں ہوتیں
جیسی کہ لاطینی ہینڈ رائٹنگ میں ہوتی ہیں۔ نتیجہ یہ
ہے کہ اول الذکر بغیر کامل سکون کے لکھا نہیں جاسکتا
حرکت سے دوائر کے زاویے بگڑ جاتے ہیں، مگر لاطینی
خط پر اس کا اثر نہیں پڑتا۔ ہاتھ کتنا ہی ہلے، لکیریں
کھنچتی ہی چلی جائیں گی۔"

(نقشِ آزاد ص ۳۳۵)

یہ بات مولانا نے اپنے قلم سے تحریر فرمائی ہے لیکن میرا خیال ہے کہ اسے اردو رسم الخط کے خلاف بہ طورِ دلیل استعمال نہیں کیا جاسکتا۔ اس لیے کہ ایسے حضرات کی تعداد جو ریل کے سفر میں بھی نوشت و خواند سے تعلق رکھتے ہوں، کتنی فی صد ہو گی؟ سو تو کیا ہزار میں بھی ایک نہ نکلے گا۔ لاکھوں میں ایک آدھ کا اوسط نکلے گا۔

بابِ نہم

املا اور علاماتِ تحریر

املا:

اردو املا کا مسئلہ شروع ہی سے مولانا آزاد کے زیر غور رہا تھا۔ الہلال (۱۹۱۲-۱۴ء) البلاغ (۱۹۱۵-۱۶ء) اور الہلال دورِ ثانی (۱۹۲۷ء) کا خاص املا تھا۔ بلاشبہ انھوں نے املا کے ویسے اصول وضع نہیں کیے جیسے کہ انجمن ترقی اردو نے اور بعض حضرات نے وضع کیے، لیکن یہ بہت بعد کی بات ہے۔ مولانا کو اس مسئلے میں "السابقون الاولون" کی حیثیت حاصل تھی۔ الہلال کے دوسرے دور میں چوں کہ اس کی ترتیب و تہذیب کی ذمہ داری مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کی تھی اور وہ الہلال کی سابقہ روایت سے واقف نہ تھے، اس لیے متعدد خطوں اور رقعوں میں ان کے بارے میں انھیں ہدایات دی ہیں۔ ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں:

> • مسودہ لکھتے وقت رسم الخط کا خیال رکھیے، تاکہ کاتب اور کمپوزیٹروں پر بھی زور چل سکے پہلے الہلال کا رسم الخط مقرر تھا، اب نہیں ہے۔ لوگ شکایت کرتے ہیں، مثلاً: حتی الامکان ہر مرکب لفظ مستقلاً لکھنا چاہیے۔ "سمجھکر" کی جگہ "سمجھ کر"، "پہنچکر" کی جگہ "پہنچ کر" وغیرہ ذالک۔
>
> ہائے مخلوط وغیرہ مخلوط میں فرق کیجیے۔ "کھانا"، "انھیں" وغیرہ کو دو چشمی ہا سے، مگر "نہیں"، "کہیں"، وغیرہ کو دو چشمی ہا سے نہ لکھا جائے" (یعنی کہنی دار ہا سے لکھنا چاہیے۔)

مولانا آزاد کی تحریر کا جو اقتباس یہاں نقل کیا گیا، اس میں مولانا نے لفظ "رسم الخط" استعمال کیا ہے۔ لیکن جو مثال درج فرمائی ہیں، ان کا تعلق املا کے مسائل سے ہے۔ اس لیے یقین

رکھنا چاہیے کہ "رسم الخط" کا لفظ محض سہوِ قلم کا نتیجہ ہے۔ یہاں محل لفظ "املا" کا ہے نہ کہ "رسم الخط" کا۔

املا مولانا کی زندگی کے آخری دور تک ان کا خاص موضوع رہا تھا۔ اس لیے وہ "تذکرہ" اور "غبارِ خاطر"، میں جن کے نسخے ان کے پیشِ نظر تھے، املا وغیرہ کی درستگی فرماتے رہتے تھے۔ مالک رام نے ان کتابوں کے مقدموں میں مولانا کی ایسی اصطلاحات کی نشان دہی کی ہے۔

علاماتِ تحریر:

مولانا آزاد کی خدمتِ زبانِ اردو کے سلسلے میں ان کے جس مضمون کا حوالہ ہمیں سب سے پہلے ملتا ہے، وہ اردو میں علاماتِ تحریر کے موضوع پر "پنکچویشن" کے وزن سے ہے اور ماہنامۂ خدنگِ نظر لکھنو کے اکتوبر اور نومبر ۱۹۰۲ء کے دو شماروں میں شائع ہوا تھا۔ اس مضمون کی دو قسطوں سے ہم اندازہ کر سکتے ہیں کہ سر سید مرحوم کے مضمون کے بعد یہ پہلا اور اس سے زیادہ جامع مضمون تھا اور صحت کے ساتھ اردو تحریر کو لکھنے اور پڑھنے میں علاماتِ تحریر (پنکچویشنز) کی مولانا کے نزدیک کتنی اہمیت تھی۔

یہ بات بھی خاص طور سے ذہن میں رکھنی چاہیے کہ اس وقت مولانا کی عمر صرف چودہ[14] برس کی تھی۔

باب دہم

مستی و تحریک کی بحث

زبان کے تعلق سے ایک اہم بحث وہ ہے جو مرزا ہادی عزیز لکھنوی کے دیوان "گل کدہ"، پر مولانا آزاد کے تبصرے سے شروع ہوئی تھی۔ عزیز مرحوم کا ایک اردو شعر تھا:

سامنے آئینہ تھا مستی تھی
ان پہ اک شانِ خود پرستی تھی

اس شعر پر تبصرے میں مولانا نے تحریر فرمایا کہ "مستی" کے لفظ میں ذم کا پہلو مضمر ہے۔ دوسرا شعر ان کی فارسی غزل کا تھا:

چوں بہ تحریکِ مشیّت عشق شد مسند طراز
خندۂ صبحِ ازل چادر گریبانم گرفت

مولانا نے فرمایا تھا کہ "تحریک" اس اردو مفہوم میں فارسی میں نہیں آتا۔

بحث میں عزیز لکھنوی اور وقت کے کئی دوسرے اہلِ قلم نے حصّہ لیا۔ صبحِ امید، لکھنو اور مخزن، لاہور نے مضامین چھاپے۔ بات کہیں سے کہیں جا پہنچی مولانا دریابادی لکھتے ہیں:

"لیجیے! زبانِ شعر و ادب کے زور آوروں کو ایک نیا شگوفہ ہاتھ آگیا اور بحث و مباحثہ کا پورا دنگل قائم ہو گیا پہلا جواب خود عزیز صاحب کا نکلا۔ تحریک کے جواب میں عرفی کی سند پیش کر دی۔ البتہ "مستی" کی بات، کہنا چاہیے کہ پوری طرح نہ بن پائی... بحث کے نتیجے سے یہاں کوئی بحث نہیں، اور نہ اس سے غرض کہ "مصرِ سخن" کا عزیز

کون ثابت ہوا اور یوسف کون؟ عرض صرف یہ کرنا ہے کہ عزیزؔ تو ٹھہرے خاص الخاص لکھنوی اور مسلّم اہلِ زبان۔ ان کی زبان پکڑنے کی ہمت اور وہ بھی خالص لکھنوی روزمرہ کے رُخ سے، کس کے بس کی بات تھی؟ اور مولانا کی لکھنویت کی کل کائنات، ان کا چھ یا سات مہینے کا قیامِ لکھنؤ۔"

(اردو کا ادیبِ اعظم، ص ۳۲)

لیکن عرفیؔ یا کسی اور اہلِ زبان کے کلام سے "تحریک" کی مثال پیش کر دینا الگ بات ہے اور یہ اعتراض کہ یہاں "تحریک" کا لفظ اپنے اردو مفہوم میں آیا ہے۔ عشق کے سندطراز ہونے کے لیے مشیّتِ الٰہی کے "اشارے" کے بجائے "تحریک" لانے پر غور و فکر کی دعوت دینا بالکل دوسری بات ہے۔ اگر کوئی چاہے تو مولانا کے اعتراض پر آج بھی ایک مجلسِ بحث و نظر آراستہ کی جا سکتی ہے۔

بابِ یازدہم

انجمن ترقی اُردو

اور

دیگر ادارے

خدمتِ اردو کے سلسلے میں مولانا ابوالکلام آزاد کا پہلا مضمون "پیٹیشن" کے عنوان سے نومبر ۱۹۰۲ء کے خدنگِ نظر، لکھنو میں چھپا تھا۔ تقریباً اسی زمانے میں انھوں نے فارسی اردو لغت پر کام کا آغاز کیا۔ اس کے بعد لسان الصدق کے اجرا (نومبر ۱۹۰۳ء) سے مولانا نے مقاصد کے جس سفر کا آغاز کیا تھا، وہ زندگی بھر انھیں مقاصد کے لیے کام کرتے رہے۔ لسان الصدق کو انجمن ترقی اُردو (جو اس وقت ایجوکیشنل کانفرنس کا ایک شعبہ تھی) کا ترجمان بنانا اسی مقصد سے تھا اور مولانا آزاد کو انجمن کا رکنِ انتظامی اور علامہ شبلی (سکریٹری انجمن) کے ساتھ اسسٹنٹ سکریٹری بنانا، ان کے اسی ایثار و خدمات کا اعتراف تھا۔

لسان الصدق کے بعد الندوہ لکھنو (۱۹۰۵-۶ء) اور وکیل امرتسر (۱۹۰۶-۷ء) ان کی زندگی کے سفرِ مقاصد کے مراحل اور ان کی خدمتِ زبان و ادب کے مختلف میدان تھے۔ الہلال کلکتہ مولانا کی ہمہ جہت خدمات کا سب سے بڑا ذریعہ تھا۔ الہلال کے ذریعے سے مولانا نے زبان و ادب، علوم و فنون اور ملک و قوم وملت کی جو عظیم الشان خدمات انجام دیں، ان کا اعتراف ہر صاحبِ علم اور اہلِ نظر نے کیا ہے۔

انجمن ترقی اردو جو اس وقت (۱۹۱۲ء میں) ایک مستقل ادارے کی حیثیت اختیار کر چکی تھی۔ اس کے مقاصد کے تعارف اور اس کے فیصلوں اور کاموں کے اعلان و تشہیر کا ایک ذریعہ الہلال تھا۔ مولانا آزادؒ نے ۱۹۱۲ء سے ۱۹۱۴ء تک الہلال، ۱۹۱۵-۱۹ء کے البلاغ اور ۱۹۲۷ء کے الہلال میں اُردو زبان، اُردو پریس اور اردو طباعت کی ترقی کے مسائل پر متعدد بار نہ صرف خود لکھا اور دوسروں کو اظہارِ خیال کے مواقع فراہم کیے، بلکہ اردو کی ترقی کے لیے ایک تحریک پیدا کردی!

انجمن ترقی اردو کے کاموں سے انھیں ہمیشہ دلچسپی رہی، وہ ہمیشہ اس کی مجلسِ نظما کے رکن رہے۔ کانگریس میں شمولیت سے پہلے اور جب تک آزادی کے بعد ہندی کو ہندستان کی قومی زبان بنانے کا فیصلہ نہیں کرلیا گیا، وہ اُردو ہی کو ہندستان کی قومی زبان بنانے کی سعی میں مصروف رہے۔ اس کے بعد بھی اردو میں تصنیف و تحقیق کے اداروں، اردو اسکولوں، اردو اخبارات و رسائل کی ترقی کی کوششوں اور اردو کو دوسری قومی زبان بنانے کی جدّوجہد میں بہ اندازِ دگر برابر مصروف رہے۔

قیام پاکستان کے بعد جب بابائے اردو مولوی عبدالحق مرحوم پاکستان تشریف لے آئے تو ہندستان میں ان کے اس اقدام اور روّیے نے نہ صرف اردو تحریک کو سخت نقصان پہنچایا بلکہ خود انجمن ترقی اردو کے حفظ و بقا کے لیے بھی بڑی سنگین صورتِ حال پیدا ہو گئی تھی، لیکن مولانا کی رہنمائی نے نہ صرف اس کی بقا کا سروسامان کردیا، بلکہ یہ مولانا کی رہنمائی ہی کا نتیجہ ہے کہ آج انجمن ترقی اردو (ہند) اردو کا ایک اہم ادارہ ہی نہیں، ایک عظیم الشان تحریک کا نام ہے۔

جس طرح مولانا نے اپنی زندگی کے مقاصد کے سفر کا آغاز اردو کی خدمت سے کیا تھا، زندگی کی آخری تقریب بھی، جس میں انھوں نے شرکت فرمائی، انجمن ترقی اردو ہی کی کانفرنس تھی جو ہندستان میں اردو کے مقام و حیثیت کے مسائل کے تصفیے اور حکومت کو اس جانب متوجہ کرنے کے لیے منعقد کی گئی تھی۔ اس کانفرنس میں مولانا کی نہ صرف شمولیت، بلکہ وہاں ایک مؤثر تقریر کرنا، وزیر اعظم پنڈت جواہرلال نہرو کو اس کانفرنس کی افتتاح کے لیے بلانا اور ان کی زبان سے اردو کے مسئلے کی اہمیت کا اعترافِ کرانا، اردو تحریک سے مولانا کی دلچسپی کا نتیجہ تھا۔

اخبارات و رسائل کے ذریعے اور کانگریس کے حلقے میں اپنے نمایاں مقام کے باعث انجمن ترقی اردو کے کاموں میں قیام پاکستان سے پہلے بھی، خصوصًا بعد میں دلچسپی لے کر، ملک کی آزادی اور کانگریس کے رہنما اور حکومت کے وزیر تعلیم کی حیثیت سے انھوں نے اردو زبان کی عظیم الشان خدمات انجام دی ہیں۔

انجمن ترقی اردو سے مولانا آزاد کے تعلق کی تاریخ ۱۹۰۳ء سے شروع ہوئی تھی اور ان کی وفات (۱۹۵۸ء) پر اس کا اختتام ہوا۔ مولانا کا یہ تعلقِ خاص اردو کے حوالے سے تھا۔ دوسرے

اداروں سے بھی مولانا کا تعلق خالص علمی ذوق اور تہذیبی روایت پسندی کے حوالے سے قدیمی اور قریبی تھا۔ یہ تمام ادارے مسلمانوں کے علمی، تہذیبی اور تحقیقی ادارے تھے۔ مولانا نے ان اداروں کے لیے بھی جو کچھ وہ کر سکتے تھے، کیا۔ خصوصاً تقسیم ملک کے بعد جب یہ ادارے اپنی تاریخ کے انتہائی نازک دور سے گزر رہے تھے، مولانا نے ان کی امداد اور دستگیری فرمائی۔

ان اداروں میں اردو کا علمی و تحقیقی ادارہ دار المصنفین، اعظم گڑھ نمایاں اور سر فہرست تھا۔ مولانا آزاد اس کے قیام کے مشوروں میں شامل تھے، اسی وقت (۱۹۱۴ء) سے اس کی مجلسِ نظما کے رکنِ رکین تھے اور زندگی کے آخری لمحے تک ان کی یہ حیثیت باقی رہی۔ قیامِ پاکستان کے بعد اس کی مطبوعات کے خریداروں کا بڑا حصہ اس کی امداد و سرپرستی سے مجبور ہو گیا اور جو مسلمان امرا و رؤسا اور اصحابِ ذوق ہندستان میں تھے صرف ان کا ذوق و ایثار ادارے کی بقاء حیات کے لیے کافی نہ ہو سکتا تھا۔ قریب تھا کہ یہ ادارہ زندگی کی آخری سانس لے اور ہمیشہ کے لیے اس کا رشتۂ حیات منقطع ہو جائے، لیکن مولانا آزاد کا دستِ مسیحا نمودار ہوا اور اس کی بقاء حیات کا سروسامان کر دیا۔ دار المصنفین کی امداد کے سلسلے میں انھیں طعنہ ہائے خویش سہنا پڑے اور اسمبلی میں جواب دہی کرنی پڑی۔

ایسا ہی ایک وقت دائرۃ المعارف العثمانیہ، حیدر آباد (دکن) کی زندگی میں آ پہنچا تھا۔ لیکن بہ قولِ مولانا عبد الماجد دریا بادی:

> "خدا غریق رحمت کرے وزیرِ تعلیماتِ ہند مولانا ابو الکلام آزاد کو کہ ان کی مسیحا نفسی نے اُسے از سرِ نو زندگی عطا کی۔"[1]

دائرۃ المعارف العثمانیہ کی نشاۃِ ثانیہ کے سلسلے میں مولانا ابو الکلام آزاد نے جو کوشش کی اس پر مولانا دریا بادی نے اپنے "سفرِ دکن" کی روداد میں روشنی ڈالی ہے۔ سفرِ دکن کی چوتھی قسط میں وہ لکھتے ہیں:

> "یاروں نے کیا کوئی کسر ادارے کے بند کرا دینے کی اٹھا رکھی

---

[1] اردو کا ادیب اعظم از مولانا عبد الماجد دریا بادی، ۱۹۸۶ء۔ کراچی ص ۹۲

رکھی تھی۔ ادارہ مسلمانوں کا مخصوص کام کر رہا ہے" فرقہ وارانہ" ہے، سیکولر حکومت میں اس کا کیا کام، اسے فوراً القط ہونا چاہیئے" قریب تھا کہ فرمانِ قضا تو اسی مضمون کا شائع ہو جائے اور حکومت آندھرا پردیش کے حکم سے ادارے کے دروازوں پر قفل پڑ جائیں، لیکن حافظِ حقیقی کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ وزیرِ تعلیم سرکارِ ہند مولانا ابوالکلام (اللہ انھیں غریقِ رحمت فرمائے) کہ انھوں نے اپنے منصبِ عالی کی کرسی سے زبردست احتجاج نامہ بھیجا کہ بند ہونا کیا معنیٰ، ایسے ادارے کو قائم ہی نہیں اور ترقی دینا چاہیے۔ بیرونِ ہند کی پڑھی لکھی دنیا میں تو سرکارِ ہند کی سیکولرزم کا بھرم ہی اس سے قائم ہے۔ اپنے سرکاری دورے میں میں نے کیا جرمنی اور کیا فرانس کیا برطانیہ اور کیا اٹلی، سب کہیں کے اہلِ علم کو اس کی خیریت دریافت کرتے اور اس کے کارناموں کے راگ گاتے ہوئے پایا، جب کہیں جا کر ادارے کی جاں بخشی ہوئی۔ اور آرزو ان لوگوں کی پوری نہ ہونے پائی جو علم و فن سے تعصب رکھنے والے اور حقیقتہً سرکارِ ہند کی نیک نامی کے دشمن ہیں۔"[1]

اردو سے مولانا آزاد کی دلچسپی خالص علمی اور تہذیبی نقطۂ نظر سے تھی، اس لیے انجمن ترقی اردو کے علاوہ ہر اس ادارے سے بھی انھیں دلچسپی تھی، جس کے مقاصد میں مسلمانوں کی تعلیم اور علوم و فنون کی ترقی و تحفظ کا مقصد شامل ہو اور جس کے ذریعے مسلمانوں کے علوم و فنون اور تہذیب و ثقافت کے

---

[1] ایضاً، ص ۹۱، ۹۲

خصائص نمایاں ہوئے ہوں۔ اس مقام پر پہنچ کر مولانا کی خدمات کا دائرہ اردو زبان وادب کی ترقی سے بہت آگے تک پھیل جاتا ہے اور اردو میں تحقیق و تصنیف کے اداروں کے علاوہ مسلمانوں کے تمام علمی، تعلیمی، تہذیبی، ثقافتی ادارے ان کے دائرہ خدمت میں آجاتے ہیں۔ مولانا نے اس قسم کے بہت سے اداروں کے لیے جو کچھ وہ کر سکتے تھے، کیا۔ ان کی ایک طویل فہرست ہے، جن میں دائرۃ المعارف العثمانیہ، رضا لائبریری، رام پور، خدا بخش لائبریری، پٹنہ، کتب خانہ ٹونک، مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ، جامعہ ملیہ، دہلی وغیرہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ مولانا سعید احمد اکبر آبادی نے مولانا آزاد کی ان علمی و تہذیبی خدمات کی طرف اپنے ایک خطاب میں فرمایا تھا:

"اب مجھے مولانا آزاد کے ان اہم کاموں کے متعلق کچھ عرض کرنا ہے، جو آزادی کے بعد مولانا نے ہندستان میں رہ جانے والے مسلمانوں کے لیے انجام دیئے تھے۔ ہندستان میں مسلمانوں کے جو ثقافتی مراکز تھے، مولانا نے ان کو محفوظ رکھنے اور ان کو ترقی دینے کی بڑی کوشش کی۔

چنانچہ دائرۃ المعارف، حیدر آباد (دکن)، جو عربی کے نادر مخطوطات کی اشاعت کا ایک نامور ادارہ ہے، اسے مولانا مرحوم نے قائم رکھا اور نہ صرف اسے قائم رکھا بلکہ اس زمانے میں اس کی ساٹھ ہزار روپے ماہوار گرانٹ مقرر کرادی۔ اللہ کا شکر ہے کہ وہ ادارہ تقسیم سے پہلے جس طرح جاری تھا، اس سے کہیں زیادہ ترقی کے ساتھ وہ اب بھی جاری ہے۔

اسی طرح ریاست رام پور کا شاندار کتب خانہ جس کا نام 'رضا لائبریری' ہے، اس کے متعلق عام خیال یہ تھا کہ تقسیم کے بعد یہ اجڑ جائے گا۔ مولانا آزاد نے اس کو باقاعدہ حکومت کی تحویل میں لے لیا اور اسے یوپی گورنمنٹ کی

نگرانی میں دے دیا۔ اللہ کا شکر ہے کہ یہ لائبریری ترقی کر رہی ہے اور اس کا لاکھوں روپے کا سالانہ بجٹ یو۔پی کی حکومت پورا کر رہی ہے۔

اسی طرح پٹنہ کی مشہورِ عالم خدا بخش لائبریری کو بھی مولانا کی کوششوں سے حکومت کی طرف سے تمام حفاظتی انتظامات مہیا کیے گئے اور اس کے لیے مولانا نے لاکھوں روپے کے سالانہ بجٹ کی منظوری حاصل کی۔ یہ ادارہ بھی نہ صرف باقی ہے بلکہ ترقی پذیر ہے۔

اسی طرح علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کا معاملہ ہے۔ اس کو بچانے میں مولانا آزاد کا بہت بڑا حصّہ ہے۔ وہاں مولانا نے آزادی کے بعد اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ قائم کیا، عربی کے شعبے کو کافی ترقی دی، اسلامیات کے شعبے کو وسیع تر کیا۔ اور آج اگر آپ علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کو دیکھیں، تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ وہ ہندستان ہی کی نہیں بلکہ ایشیا کی ان عظیم الشان یونی ورسٹیوں میں سے ہے جن پر مسلمان بجا طور پر فخر کر سکتے ہیں۔ اس کی ترقی میں بہت بڑا دخل مولانا ابوالکلام آزاد کا ہے۔

کم و بیش یہی صورتِ حال جامعہ ملیہ، دہلی کی ہے۔ وہ بھی بھارت کی ایک مثالی یونی ورسٹی کا مقام حاصل کر چکی ہے۔ مزید برآں کئی دینی مدرسے اور ثقافتی مراکز مولانا کی کوششوں سے شرارت پسندوں کی دست برد سے محفوظ رہے۔

الغرض مولانا ابوالکلام آزاد نے آزادی کے بعد

نہایت ناساعد حالات میں بھی بھارت میں مسلمانوں
اوراسلام کی خدمت بڑی جرأت، دلیری، ہمت اور
بہادری کے ساتھ کی ہے۔"[1]

اس بیان میں کتب خانہ ٹونک کا ذکر نہیں آیا، لیکن مولانا نے اپنی زندگی ہی میں اس کے تحفظ کے انتظامات بھی فرمادیے تھے۔

حضرت مولانا ابوالکلام آزاد کے یہ تمام اقدامات ومساعی علوم وفنون سے ان کی دلی وابستگی کے غماز ہیں اور اردو کی ترقی کے لیے بنیادی سروسامان کی حیثیت رکھتے ہیں۔

---

[1] مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم از مولانا سعید احمد اکبرآبادی، ۱۹۸۷ء کراچی، ص ۵۱ تا ۵۳

باب دوازدہم :

مولانا آزاد کی ادبی وفنّی عظمت کی بنیاد؟

مولانا ابوالکلام آزاد کے سلسلے میں ایک اہم سوال یہ ہے کہ اُن کی ادبی وفنّی عظمت کی بنیاد کیا ہے؟

صحّتِ زبان یا اسلوبِ نگارش؟

میری نظر سے پنڈت دتاتریہ کیفیؔ دہلوی کے بعض اعتراضات گزرے ہیں، جو انھوں نے مولانا آزاد کی زبان پر کیے ہیں۔ ایک اور صاحب جو پاکستان تشریف لائے اور چوں کہ کافی دیر میں تشریف لائے تھے، اس لیے اپنے آنے کے جواز میں مولانا آزاد کے خلاف بعض خیالات اور چند دُشنام ساتھ لا اہلِ پاکستان کے لیے تحفہ ساتھ لائے۔

پنڈت کیفیؔ صرف ادیب نہ تھے، وہ زبان کا بھی خاص ذوق رکھتے تھے۔ اگرچہ ان کے سامنے الہلال کے چند جملے تھے، جن کے بارے میں نہیں کہا جاسکتا تھا کہ وہ جس طرح چھپے ہوئے موجود ہیں، مولانا کے قلم سے بھی اسی طرح نکلے تھے، بالفرض اگر مولانا کے قلم سے اسی طرح نکلے ہوں تب بھی مولانا کی تحریر کو "صحّتِ زبان" کے خصائص کے دائرے سے خارج نہیں کیا جاسکتا ہے۔ اس قسم کے اغلاط سر سید مرحوم کے ہاں بے شمار اور حالیؔ کی تحریروں میں بھی مل جائیں گے۔ زبان کے باب میں مولوی نذیر احمد کے درجۂ استناد سے کون انکار کرسکتا ہے، لیکن جوشؔ ملیح آبادی کی رائے اس باب میں بھی اُن کے بارے میں بہت مشہور تھی۔

دوسرے صاحبِ قلم "حبیب احمد" ہیں۔ انھوں نے مولانا کی زبان کے بارے میں ترجمان القرآن سے مثالیں دی ہیں۔ لیکن یہ مثالیں چند افعال کی ہیں۔ گرامر کے قاعدوں کو کسوٹی بنا کر تحریر کردی گئی ہیں۔ گرامر کے وہ قاعدے جن کے بیش تر مؤلف زبان کا کوئی خاص ذوق بھی نہ رکھتے تھے۔

اور جن میں سے کئی حضرات کی علمی حیثیت زبان اور لسانیات و لغات کے علم و ذوق میں صفر سے کچھ زیادہ نہیں ہو سکتی۔ اگر ایسی غلطیاں ہی نکالی جائیں تو سرسید کی کسی تحریر کا کوئی صفحہ دو چار غلطیوں سے خالی نہیں ہو سکتا۔ لیکن معلوم ہے کہ سرسید علمائے لسانیات کے اُن بزرگوں میں شمار ہوتے ہیں جن کی زبان و تحریر سے قواعد زبان کے اصول وضع کیے جاتے ہیں۔ اُن کی زبان و تحریر کو کسی قواعد نگار کے وضعیات پر پرکھا نہیں جا سکتا۔ مولانا ابوالکلام آزاد کا شمار بھی ایسے ہی علمائے لسانیات میں ہوتا ہے۔ اگرچہ اس نقطۂ نظر سے مولانا کی زبان پر ابھی تک کسی عالم نے توجہ نہیں فرمائی۔

حبیب صاحب نے جو مثالیں مولانا کی زبان کی دی ہیں، ان کا تعلق عدمِ صحت سے زیادہ عدمِ پسند سے ہے۔ میں نے اوپر کی سطروں میں ایک جملہ لکھا ہے: "مولانا کی تحریر کو "صحتِ زبان" کے خصائص کے دائرے سے خارج نہیں کیا جا سکتا"

حبیب صاحب نے مولانا کے ترجمان القرآن سے ایسی متعدد مثالیں دی ہیں اور بتایا ہے کہ یہاں "کر دیا جا سکتا ہے" غلط ہے "کیا جا سکتا" ہونا چاہیے۔ ان کے پیشِ نظر اصول یہ ہے کہ اس قسم کے فعل کی قواعد کی کسی کتاب میں مثال نہیں ملتی۔ لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا، یہ مسئلہ زبان کی صحت یا عدمِ صحت کا نہیں بلکہ پسند اور ناپسند یا محض "ذوق" کا ہے۔ حبیب صاحب کسی بھی معقول چیز کو "ناپسند کر دینے" کا حق رکھتے ہیں، لیکن یہ ان کا منصب نہیں کہ وہ جس چیز کو ناپسند فرمائیں اسے دنیا سے غلط قرار دلوانے کی بھی کوشش کریں۔ اب اگر آں موصوف کی نظر سے یہ سطریں گزریں گی تو وہ فرمائیں گے کہ یہ جملہ غلط ہے۔ میں "ناپسند کر دینا" ہرگز نہ لکھتا۔ میرے نزدیک "ناپسند کرنا" کافی اور صحیح ہے۔

بعض الفاظ کی تذکیر و تانیث کے بارے میں بھی اعتراض کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں بھی عرض ہے کہ تذکیر و تانیث کے قواعد کے واضعین میں بھی کم علم اور کم ذوق موجود ملیں گے۔ پھر جو کچھ قاعدے اور اصول بنائے گئے ہیں، وہ بھی تمام متفق علیہ نہیں۔ پھر ایک ایسے عالمِ لسانیات کو جو اپنے آپ کو کسی ایک سے وابستہ کرنا نہیں چاہتا، کسی اصول کے ماننے پر کیوں کر مجبور کیا جا سکتا ہے۔ پھر یہ مسئلہ بھی غلط اور صحیح کا نہیں، پسند اور ناپسند کا ہے۔ اس کا تعلق ذوق سے ہے یا محض

ایک روایت کے ترک واختیار کا ہے۔ مولانا کی کتاب "غبارِ خاطر" لاہور میں چھپ رہی تھی۔ اُس میں لفظ "موڑ" مؤنث استعمال ہوا تھا۔ مولانا مہر مرحوم نے انھیں لکھا کہ "موڑ" کا لفظ تو مذکر ہے۔ مولانا آزاد نے جواب دیا:

"موڑ کا لفظ میری زبان پر مؤنث ہی چڑھا ہوا ہے
اور مجھے کبھی اس میں شک نہیں ہوا۔"

(نقشِ آزاد، ص ۱۸۵)

اردو میں پچاسوں لفظ ہیں، جن کے بارے میں تذکیر وتانیث کا فیصلہ نہیں ہوسکا۔ ہر شخص اپنے ذوق یا عادت کے مطابق استعمال کرتا ہے۔

درحقیقت یہ مسئلہ صحیح یا غلط کا ہے ہی نہیں محض عادت یا پسند ناپسند کا ہے۔

ہر زبان کے علما کی بعض ایسی شخصیتیں ہوتی ہیں جو گرام کے قاعدوں اور اصولوں کی پابندی سے مستثنیٰ قرار پاتی ہیں۔ وہ قواعد کی پابندی نہیں کرتیں، ان کی تحریروں سے قواعد کے اصول وضع کیے جاتے ہیں۔ ایسے اہلِ زبان اگر قواعد کے کسی اصول کے خلاف کوئی لفظ استعمال کرتے ہیں، تو یہ اُن کے مستثنیات اور خاص مختارات شمار ہوتے ہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد علمائے لسانیات کی اسی جماعت سے تعلق رکھتے تھے۔

یہ اشارات اس بات کا فیصلہ کرنے میں یقیناً مدد دیں گے کہ مولانا ابوالکلام آزاد اُردو کے نہ صرف ایک بے مثال ادیب اور مایۂ ناز انشا پرداز تھے، بلکہ وہ ایک عالم وماہر لسانیات بھی تھے۔ اور اُن کی عظمت کی بنیاد صرف اُن کا اسلوب وانشا ہی نہیں بلکہ علمِ زبان میں اُن کی نظر ومہارت اور اُردو زبان کی خدمت بھی ہے۔

ابوسلمان شاہجہاں پوری

۲رمارچ ۱۹۸۷ء

بابِ سیزدہم

حرفِ آخر

مولانا ابوالکلام آزاد کے اسالیبِ بیان، زبان اور اُس کے مختلف مسائل کے بارے میں ان کے افکار و افادات کے مطالعے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اگرچہ مولانا کا پسندیدہ اسلوب وہی ہے جو الہلال اور تذکرہ میں نمایاں ہوا تھا لیکن اردو زبان کی ترقی اور روزمرّہ کی زندگی کے مختلف دائروں میں اُس کے قبول و رواج کے لیے ضروری ہے کہ

۱۔ زبان سادہ اور عام فہم ہو۔

۲۔ تشبیہات و استعارات اور مترادفات کے کثرتِ استعمال سے احتراز اور ہر طرح کے حشو و زوائد اور تکرارِ الفاظ و مضمون سے گریز کیا جائے۔

۳۔ قواعد کی پابندیوں کے مقابلے میں محاورہ و روزمرہ پر عمل کرنا چاہیئے، لیکن خواہ مخواہ گرام کے اصول و قواعد کی خلاف ورزی بھی نہ کی جائے۔

۴۔ مروّج اور زبان زدِ خاص و عام انگریزی کے الفاظ جن کے مفہوم نے عام ذہنوں میں جگہ بنالی ہے، انھیں اُسی طرح استعمال کرلینا چاہیے۔

اس اصول کی روشنی میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ملک کی مختلف زبانوں کے وہ سیکڑوں الفاظ جو عوام کی زبانوں پر چڑھ کر ذہنوں میں جگہ بنا چکے ہیں، انھیں اردو تحریر میں بے تکلف استعمال کرلینا چاہیے۔

اصطلاحات کے سلسلے میں مولانا کے افکار اِن اصولوں کی طرف رہنمائی فرماتے ہیں:

۱۔ ترکیب سُبک و سہل ہو

۲۔ الفاظ ایسے ہوں جو زبانوں پر بہ آسانی رواں ہوسکیں۔

۳۔ ترکیب طویل نہ ہو۔

۴۔ الفاظ ثقیل، مغلق اور نادرالاستعمال نہ ہوں۔

۵۔ لیکن اگر ثقیل و مغلق اور نادرالاستعمال لفظ یا ترکیب بہ طورِ اصطلاح رواج پا گئی ہو تو اس کے بدلنے کی بھی کوئی خاص ضرورت نہیں۔ اصل یہی ہے کہ کوئی لفظ یا مجموعۂ الفاظ کسی خاص معنی میں رواج پا جائے اور اس فن کے دائرے میں اس کا مفہوم معروف ہو جائے۔ ابھی کل کی بات ہے کہ "مقتدرہ قومی زبان" میں مقتدرہ کے لفظ پر کیا کیا کچھ نہ گل افشانیاں کی گئی تھیں، لیکن آج وہی لفظ زبانوں پر ایسا رواں ہوا ہے کہ اب کوئی اُس کے نہ تو معنی پوچھتا ہے۔ نہ اس کی ثقالت و اغلاق کا شکوہ کرتا ہے، نہ اردو زبان و لغات کی تاریخ میں اس کے اسناد تلاش کیے جاتے ہیں اور نہ یہ لفظ سن کر کسی کے لبوں پر خندۂ استہزا نمایاں ہوتا ہے۔ بہ قول مولانا آزاد کے اصل چیز تداول و استعمال ہے۔